ڈاکٹر ذاکر نائک
کے
خیالات اور نظریات

از

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی

استاذ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ

شائع کردہ

Khatme Nubuwwat Academy

387 KATHERINE ROAD, FOREST GATE
LONDON E7 8LT, UNITED KINGDOM
Phone 020 8471 4434
Mobile: 0798 486 4668, 0795 803 3404
Email: khatmenubuwwat@hotmail.com
Website: www.khatmenubuwwat.org

دعوتِ اسلام اور داعی کی ذمہ داریاں

از حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دامت برکاتھم (مفتی اعظم مہاراشٹر)

دین کی دعوت امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ کتاب وسنت کی نصوص اس پر شاہد ہیں کہ جن حضرات تک توحید ورسالت اور دین کا پیغام نہیں پہنچ سکا، امتِ محمدیہ اس کی مکلّف ہے کہ ان تک یہ دعوت پہنچائے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی واضح ہدایت ہے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان حضرات تک یہ پیغام پہنچائیں جو موجود نہیں؛ دعوت کا ایک شعبہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہے، ساتھ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے ایک طبقے کا موجود رہنا بھی قرآن نے ضروری قرار دیا ہے۔ اسلام اور اسلامی اصولوں کے خلاف اس عہد کے معترضین جو اعتراضات کرتے تھے کتاب وسنت میں ان کے جوابات بھی موجود ہیں، اس طرح دعوت کے ضمن میں یہ تین شعبے سامنے آتے ہیں۔

(۱) خالص توحید ورسالت اور دین حق کی طرف بلانا۔

(۲) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

(۳) اسلام اور اسلامی تعلیمات کا دفاع اور پیدا کیے جانے والے شکوک وشبہات کا ازالہ۔

انبیائے کرام علیہم السلام کا اولین منصب ہی داعی الی اللہ کا منصب ہے، جتنے بھی انبیائے کرام علیہم السلام اللہ کی طرف سے بھیجے گئے سب نے اپنی رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ اللہ کی توحید عقیدۂ آخرت اور احکامِ خداوندی کے مطابق زندگی گزارنے کے طرف اپنی اپنی امتوں کو بلایا اور جب تک انسانوں کے درمیان رہے یہی ان کی جدوجہد کا محور رہا۔ قرآنِ کریم نے حضور نبی کریم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ میں دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ کو بڑے نمایاں انداز میں بیان کیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہیں عن المنکر بھی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا جزو رہا ہے اور انہوں نے اپنے امتیوں کو خیر اور بھلائی والے اعمال کو اختیار کرنے اور برائیوں سے دور رہنے کی

مستقل تربیت دی ہے۔ ان کے عہد میں اس دعوت پر جو شکوک و شبہات عائد کیے گئے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے انتہائی سادہ انداز میں وحی ربانی کی تائید سے ان کا بھی ازالہ کیا، کبھی یہ جوابات تحقیقی ہوتے تھے اور کبھی الزامی، جیسی ضرورت ہوئی ویسا اسلوب اختیار کیا گیا؛ لیکن دعوت کے بنیادی اصولوں سے انحراف اور وحی ربانی کی ہدایات اور اللہ کی مرضی کے خلاف محض دفع الوقتی کے لیے کوئی جواب نہ ان حضرات نے دیا اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان تھا۔

آں حضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ اختتام پذیر ہو گیا لیکن یہ ضرورتیں بہر حال باقی رہیں، حدیث پاک کی رو سے اب یہ فریضہ علمائے امت کے ذمے ہے۔

تاریخِ اسلام کے ہر عہد میں ہمیں ایسے رجال کار نظر آتے ہیں جو تاحیات اس سلسلے میں جد وجہد کرتے رہے اور ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو تاریخِ اسلامی میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پوری تاریخ کا بیان کرنا مقصود بھی نہیں اور کسی مختصر تحریر میں اسے بیان بھی نہیں کیا جا سکتا، اس کے لیے تو دفتر بھی ناکافی ہیں، یہاں صرف سرسری مطالعہ ہی ممکن ہے۔

تاریخ میں ہمیں دعوتِ اسلامی کو اپنی زندگی کا مقصد بنانے والی بے شمار شخصیات ملتی ہیں، سب میں قدرِ مشترک یہ تھا کہ عقیدے کی پختگی کے ساتھ ساتھ وہ اعمال و کردار کی پختگی میں دوسروں سے کہیں آگے تھے اور اس جد و جہد کے دوران بھی کتاب و سنت کے اصولوں سے انحراف کا تصور بھی نہ رکھتے تھے۔

اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچانے میں حضرات صوفیائے کرام رحمہم اللہ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، انھوں نے نہ اسٹیج سجائے اور نہ امت سے کوئی صلہ طلب کیا بلکہ خاموشی سے اپنی جگہ پختہ عزم و ارادے کے ساتھ بیٹھ کر لوگوں کو اللہ کی عظمت و کبریائی کی جانب بلاتے رہے اور ان کے

کردار کی پختگی نیز اعمال کے کتاب وسنت کے عین مطابق ہونے کا یہ اثر تھا کہ لوگ فوج درفوج ان کے پاس آتے اور کلمۂ شہادت کی گواہی دیتے ہوئے اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ برصغیر میں آج جو مسلمان ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کے آباواجداد عرب کی سرزمین سے آکر یہاں بس گئے ہوں اور ہم انہیں پشتینی مسلمان کہہ سکیں، اکثر یہیں کے لوگ حضرات صوفیائے کرام کی دعوت اور ان کے کردار سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور بحمد اللہ ان کی نسلیں آج تک صراط مستقیم پر گامزن اور دامن اسلام سے وابستہ ہیں۔

صوفیائے کرام، دوسرے علماء نے امت کے احتساب کی ذمے داریاں بھی نبھائیں اور جو لوگ ان سے وابستہ ہوئے ان حضرات نے کوشش یہ کی کہ وہ رذائل سے دور ہوں، اسلامی خصلتوں کو اپنائیں حلال کو اختیار کریں، حرام سے بچیں اور احکامتِ الٰہیہ کی تابعداری اس طرح کریں کہ کوئی سنت ترک نہ ہونے پائے؛ غرض یہ کہ انہوں نے اپنے متعلقین کی تربیت اس انداز سے کی کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوکر سچے مسلمان کا مصداق بن سکیں اور معروف کو اختیار کرنے اور منکرات سے دور رہنے کے خوگر بن جائیں۔

صوفیائے کرام سے ہماری مراد وہ صوفیاء ہیں جو خالص کتاب وسنت کی دعوت دینے والے تھے، جو غلوں میں مبتلا یا اسلام کی روشن شاہراہ سے منحرف تھے ان کا یہاں کوئی ذکر نہیں، وہ امت کی اصلاح کیا کرتے خود ہی اصلاح کے محتاج تھے۔

اسلام پر اعتراضات اور شکوک وشبہات پیدا کرنے کا سلسلہ ابتدائے اسلام ہی سے نظر آتا ہے لیکن یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ امت نے اس طرف بھی ہر دور میں مناسب توجہ دیتے ہوئے دفاعِ اسلام کا فریضہ بھی کما حقہ انجام دیا۔ فقہائے اسلام اور محدثین ومفسرین کے پہلو بہ پہلو حضرات متکلمین کا ایک حلقہ بھی اپنا وجود رکھتا ہے، جن کا کام ہی یہ رہا کہ اسلام پر جو اعتراضات غیروں کی طرف سے کیے گئے ہوں یا جہاں شکوک وشبہات کے ذریعہ لوگوں کو حق سے منحرف کرنے

کی کوششیں ہورہی ہوں، ان سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد کتاب وسنت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان کا واضح اور مسکت جواب دیا جائے، اور وہ حضرات اس میں کامیاب بھی رہے۔ فلاسفہ کے اشکالات ہوں یا ملحدین کے اعتراضات کتاب وسنت پر اشکالات کیے گئے ہوں یا اسلامی عقائد و احکام کو ہدف بنایا گیا ہو، ان حضرات نے کسی سوال کو لاجواب نہیں رہنے دیا اور جو کچھ اس کے متعلق وہ لکھ گئے وہ بعد والوں کی رہنمائی بھی کرتا رہے گا۔ خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی مسلّمات اور حقائق و واقعات کا نہ انکار کیا اور نہ ان کی بے جا تاویلیں کیں، بلکہ اعتراض کرنے والوں میں جو کج فکری تھی اسے واضح کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کی نشاندہی اور غلط فہمیوں کا جیسا چاہیے تھا ویسا ہی مناسب ازالہ کیا۔

ہمیں دورانِ مطالعہ ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جنہوں نے اعتراضات سے گھبرا کر اسلامی مسلَّمات ہی سے انکار کر دیا یا ان کی بے جا تاویل کیں، مگر ظاہر ہے یہ نہ تو اسلام کی خدمت ہے اور نہ ایسے دفاع کی اسلام کو کوئی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کا دفاع اسی وقت معتبر مانا جائے گا جب ان میں نہ تو مسلّمات کا انکار ہو اور نہ تاریخ اور حقائق سے روگردانی کی گئی ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امت نے ہر دور میں داعیانِ اسلام بالخصوص اسلامی دفاع کے میدان میں سرگرم رجال کار کی تحسین و پذیرائی کرتے ہوئے ہمیشہ انہیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور ان کی تائید و نصرت کو اپنی ذمے داری سمجھ کر جب بھی ضرورت ہوئی ان کا ہر ممکن تعاون کیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اپنے ساتھ کئی فتنے لائی؛ ان میں سے بڑا فتنہ اسلامی عقائد و تعلیمات پر اعتراضات اور مسلمانوں کو حق سے منحرف کرنے کا تھا، اس دوران جن بہت سے بزرگوں نے کامیاب دفاع کرتے ہوئے معترضین کو پسپا کیا، ان میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر علیؒ مرحوم، اور بانی دار العلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اس دوران کچھ ایسے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے مسلّمات اور حقائق کا انکار کرنے یا ان کی

بے جا تاویل کا طریقہ اپنایا، مگر ظاہر ہے یہ نہ تو اسلام کی خدمت تھی اور نہ ہم اسے مستحسن کہہ سکتے ہیں۔

جو حضرات اس میدان میں سرگرم عمل ہوئے ان میں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے بعد میں اسلامی تعلیمات ہی کو بدلنا شروع کر دیا لیکن جب تک ان کا مقصد سامنے نہیں آیا وہ امت میں مقبول بھی رہے اور ان کی تائید و تحسین بھی ہوئی؛ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے، شروع میں یہ مبلّغ اسلام بن کر سامنے آیا اور اعتراض کرنے والوں تک پہنچ کر جواب دینے والے خادم اسلام کی حیثیت سے شہرت پائی؛ لیکن بعد میں اس نے جس طرح مہدی، نزولِ عیسیٰ اور ختمِ نبوت کی غلط تشریح کرتے ہوئے خود مہدیت، مسیحیت اور نبوت کے دعوے کیے، انہوں نے اس کو مقبولین کی صف سے نکال کر مردودوں کی صف میں لا کھڑا کیا؛ کچھ لوگ اس کی اس گمراہی کا شکار بھی ہوئے لیکن امت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مرزا غلام احمد اور اس کے متبعین کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ پورا طبقہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ قادیانیت نے اپنے گماشتے بھی چھوڑ رکھے ہیں، جن سے قادیانیوں کے گہرے روابط ہیں، اگر چہ بظاہر وہ اسلام کا جھنڈا بلند کیے نظر آتے ہوں مگر یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں ہے۔ بات چل رہی تھی دعوت دین کی لیکن اس سلسلے میں بعض اوقات جو کوتاہیاں ہوتی ہیں یا غلط فکر رکھنے والے جس طرح دین کی...... دعوت کو آڑ بنا کر اپنے مسموم نظریات پھیلاتے ہیں اور امت کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی نشان دہی بھی ضروری ہے۔ درمیان میں اس کا ذکر آ گیا۔ تاہم یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔

ہمارے سامنے ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب ہیں، اسلامی مبلّغ اور داعی کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے ہیں اور ٹی وی چینل وغیرہ پر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ اُس میں شک نہیں کہ انہوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ بڑا مفید، مستحسن اور قابلِ قدر ہے۔

افریقہ کے مشہور مبلّغ احمد دیدات صاحب نے عیسائیت کے خلاف بڑی مفید اور کامیاب خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے سی ڈیز اور آڈیو کیسٹ وغیرہ دیکھ کر جو حضرات اس جانب متوجہ ہوئے

،ان میں ڈاکٹر ذاکر نائیک بھی تھے،شروع میں ان کا دائرۂ کار ردّ عیسائیت تک محدود تھا،اس کے بعد دوسرے مذاہب والوں نے جو اعتراضات کیے یا کرتے ہیں،اس پر بھی ذاکر نائیک صاحب بولنے لگے،یہاں تک تو معاملہ غنیمت تھا،بعد میں مختلف اسلامی موضوعات اور آیاتِ قرآنی کی تشریح وتفسیر بھی شروع ہوگئی۔اس سلسلے میں یہ ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ تفسیر ہو یا دوسرے اسلامی موضوعات ان کے لیے علمی حدود متعین ہیں؛اگر کوئی عالم وفاضل بھی ان حدود سے تجاوز کرے گا تو یہ اس کا تفرد کہلائے گا،تفسیر وغیرہ کے لیے اہلیت ضروری ہے، جو اہل نہ ہو وہ جب کچھ کہے گا یا لکھے گا تو قوی امکان ہے کہ اپنی رائے کو داخل کردے، جب کہ تفسیر بالرائے امت کے اجماعی فیصلے کے مطابق مردود ہے اور جو قصداً اس کا مرتکب ہو حدیث میں اس کے لیے جہنم کی وعید ہے۔دیگر دینی موضوعات کا معاملہ بھی یہی ہے کہ امت نے تسلسل کے ساتھ جو طے کررکھا ہے اس سے انحراف سراسر گمراہی ہے ،ہمیں ڈاکٹر صاحب سے یہ حسنِ ظن ہے کہ وہ تفسیر بالرائے یا امت کے اجماعی فیصلوں سے انحراف سے دور ہی رہنا چاہیں گے، دینی اصلاحات کا جو مفہوم اور مصداق امت نے سمجھا اور بطور وراثت ہم تک منتقل ہوکر آیا،امید تو یہی ہے کہ ذاکر صاحب اس میں بھی کسی تبدیلی کو صحیح نہ سمجھتے ہوں گے۔

مبلغ اسلام کی حیثیت سے امت کے سامنے آکر بعد میں مسیحیت ونبوت کے مدعی غلام احمد قادیانی کا انجام بھی ان کے سامنے ہوگا اور وہ اس روش کی تباہ کاریوں سے بھی بخوبی واقف ہوں گے ،اس لیے اب تک تو یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ خدانخواستہ ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی یہ راہ اپنا سکتے ہیں،تا ہم یہ ضرور ہے کہ داعی اسلام کے عظیم منصب پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک خاص مسلک کی ترویج واشاعت کا جو بیڑا اٹھالیا ہے، وہ ان کے قد کو بلند کرنے کے بجائے ان کو پستہ قد بناتا جارہا ہے اور ہم جیسے بہت سے لوگ جو ابتداء میں بجا طور پر ان سے حسنِ ظن رکھتے تھے،اب ان کی سابقہ خوش فہمی باقی نہیں رہی۔

حدیث نبوی ہے کہ امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی، یہ بھی مسلّم ہے کہ دو ہی قسم کے لوگ ہوسکتے

ہیں جو اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہوں اور جو اس سے محروم ہوں۔ اس دوسرے گروہ کے لیے اجماعی فیصلہ ہے کہ ان کے واسطے تقلید مجتہد ضروری ہے، ورنہ وہ اسلام ہی سے ہاتھ دھولیں گے۔ ذاکر صاحب نے جس طرح ائمہ مقلدین کو نشانہ بنا رکھا ہے اول تو اس مسلمہ اصول اور حدیث نبوی ﷺ کے خلاف ہے کہ امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، دوسرے انہوں نے یہ طریقہ کار اپنا کر خود کو بہت محدود کر لیا ہے۔ پہلے وہ اسلام کے داعی اور مبلغ تھے، اب ایک خاص اور ایسے مسلک کے مبلغ ہیں جو پوری امت کو گمراہ اور مشرک قرار دیتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے وہ اجتہاد کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے اور شاید ان کا یہ دعویٰ بھی نہیں، لیکن اس کے باوجود بعض علمی موضوعات پر ان کے جو اجتہادات سننے میں آئے وہ باعث تعجب ہیں۔

اعتراضات کے جوابات میں بھی وہ بعض اوقات علمی حدود کو پار کرتے نظر آتے ہیں، حالانکہ دنیا میں بھلے ان سے کوئی مواخذہ نہ کیا جاسکے، آخرت میں یقیناً جوابدہی کرنی پڑے گی۔

کچھ عرصہ قبل انہوں نے یزید کے متعلق بھی ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہتے ہوئے ایک بے فائدہ بحث چھیڑ کر خود کو اور متنازعہ بنا لیا، حالانکہ انہیں خود بھی یہ علم ہوگا آخرت میں یہ سوال ہرگز نہ کیا جائے گا کہ یزید کو مرحوم و مغفور کہتے تھے یا مردود سمجھتے تھے؟ یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ احقاقِ حق ضروری ہو اور اسے مستقل موضوع بنا لیا جائے، جو شخص داعی اسلام کی حیثیت رکھتا ہو اسے خاص طور پر احتیاط کی ضرورت ہے۔ علمی موضوعات پر بھی جب وہ بولتے ہیں تو بعض وقت کتاب وسنت کی تصریحات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

پیش نظر تحریر مولانا مفتی عبد اللہ الاسعدی صاحب نے اس قبیل کی چند فروگزاشتوں کا ذکر کرتے ہوئے صحیح جوابات کے سلسلے میں متعلقہ نصوص کی نشاندہی بھی کی ہے اور ذاکر نائیک صاحب نے ان آیات پر اعتراضات کے جواب میں جو غلطیاں کیں ہیں، انتہائی سنجیدہ اور مثبت انداز میں ان کی نشاندہی بھی کر دی ہے، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

امید ہے کہ مفتی صاحب کی یہ مختصر تحریر ذاکر صاحب کی تحریک کو سمجھنے میں بڑی حد تک مؤثر ثابت ہوگی۔ ہم ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب سے یہ ضرور کہیں گے کہ آپ داعی کی صفات کو سمجھ کر انہیں پوری طرح اپنائیں، خود کو کسی خاص نظریے کا مبلغ نہ بناتے ہوئے اسلام کے دفاع تک محدود رہیں اور بے جا اجتہادات سے بھی گریز کریں؛ مسلّمات کو بھی نہ چھیڑیں اور ایسے موضوعات سے بھی بچیں جن کے متعلق آخرت میں آپ سے کوئی سوال نہ کیا جائے گا، امید ہے کہ یہ گزارش صد بصحرا ثابت نہ ہوگی۔

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

حرفِ چند

از سعید الرحمن فاروقی (القاسمی)

(مفتی) دار العلوم امدادیہ ممبئی-۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن وحدیث اور اسلامی قانون کی تشریح جو علمائے سلف سے منقول ومتداول ہے اس کے خلاف کسی دانشور کی بیجا اجتہادی کاوش کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اسلامی ذخیرہ علم میں جس طرح سلف کی نقل حجت ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں، اسی طرح ان کی فہم بھی حجت وسند ہے، بصورت دیگر دین کی حفاظت وصیانت میں کوتاہی بلکہ تحریف کا شدید اندیشہ ہے، اشاعت تو بعد کی بات ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک جس ذخیرۂ علم سے استفادہ کر کے دانشوری کے اسٹیج پر پہونچے ہیں اس کے جمع کرنے والوں کی تشریحات وفہم پر اعتماد بھی ان کا ایمانی واخلاقی فریضہ ہے۔

اس مختصر کتابچہ میں خانوادۂ علم وفضل کے تابندہ ستارے حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کے معتمد اور جامعہ عربیہ ہتھورا کے شیخ الحدیث، مجمع الفقہ الاسلامی کے جنرل سیکریٹری، کثیر التصانیف عالم وفاضل محترم مولانا مفتی عبید اللہ صاحب الاسعدی مدظلہ العالی نے اس بیجا روش کا معقول اور مدلل جائزہ لیا ہے۔ امید کہ ان شاء اللہ ڈاکٹر ذاکر نائیکؒ کے لیے نصیحت اور دوسروں کے لیے باعث عبرت ہوگا۔

واللہ ولی التوفیق

دعوتِ اسلام کی اہمیت اور حدود وضوابط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم

اما بعد

ارشاد ربانی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ [سورۂ انفال:٦٠]

اس کا حاصل یہ ہے کہ دین کی حفاظت، نشر واشاعت، دفاع واقدام کے لیے جو ممکنہ اسباب و ذرائع ہوں ان کو اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ حسب موقع وحالات مستحسن وضروری ہے۔ بشرطیکہ وہ اسباب ایسے ہوں کہ ان میں کتاب وسنت کی صراحت ومقاصد سے معارضہ نہ ہو اور مخالفت نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ وجہاد میں وقت کے بدلنے کے ساتھ نت نئے ہتھیار وآلات سے کبھی احتراز نہیں کیا گیا اور نہ علم ودین کی اشاعت وحفاظت کے لیے مناسب وممکنہ صورتوں سے انکار کیا گیا۔

اور اسی بنیاد پر کہ اس وقت کے اہلِ نظر محققین نے --- سب نے یا ایک بڑی ومعقول تعداد و جماعت نے --- یہ رائے اختیار کر لی ہے کہ موجودہ ذرائع ابلاغ کا استعمال دینی، عملی، دعوتی، تبلیغی، اصلاحی مقاصد ومساعی کے لیے جائز ودرست ہے اگر ضروری نہ کہا جائے، ورنہ تو ضروری بھی قرار دیا جا سکتا ہے، خواہ ریڈیو وٹیپ ہو یا ٹی وی، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ۔ بالخصوص اس لیے بھی اس کی اجازت وضرورت ہے کہ اہل باطل ان چیزوں کو بے دریغ استعمال کر کے اپنے افکار ونظریات کی خوب اشاعت کر رہے ہیں۔

اب اگر اہل حق ان موجودہ مقبول عام ذرائع سے مکمل صرف نظر کریں گے تو آج کے حالات

میں بڑے نقصان کا اندیشہ ہے جیسا کہ ثابت بھی ہو رہا ہے۔ جبکہ آج صورت یہ ہے کہ ایک بڑا طبقہ انہیں ذرائع پر ہی اکتفاء کر رہا ہے۔

ہم لوگ بھی اپنے بعض اہل نظر اکابرین کی موافقت کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں، اگر چہ عموماً اب تک نہ ٹی وی پر گئے اور نہ ٹی وی لائے اور نہ دیکھنے کا اہتمام و مزاج و معمول ہے۔ اتفاق سے ہی سابقہ پڑ جاتا ہے۔ اور انٹرنٹ کا معاملہ تو اور دور ہے۔ اس لیے ٹی وی اور انٹرنٹ پر اسلام سے متعلق کیا آ رہا ہے براہِ راست اس سے واقفیت نہیں، ہاں سنتے رہتے ہیں، کبھی اس قبیل کی چیزیں پڑھنے میں بھی آ جاتی ہیں۔

ادھر چند سالوں سے ٹی وی دیکھنے والوں کے واسطے سے دین کے ایک داعی و ترجمان کی حیثیت سے ایک نام جو بہت سننے میں آیا اور آ رہا ہے وہ ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کا نام ہے بالخصوص کیو ٹی وی(QTV Pakistan) (اور اب PeaceTV پیس ٹی وی) سے مستفید ہونے والوں سے ان کی بابت زیادہ سنا گیا، اس سلسلہ میں سوالات بھی سامنے آئے اور آتے ہیں اور کچھ گفتگو بھی ہو جاتی ہے، براہِ راست کوئی سابقہ نہیں پڑا کیونکہ زبان کا معاملہ یہ ہے کہ ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

حجازِ مقدس کے ایک سفر میں ان کے خواص رفقاء میں سے چند کا ساتھ رہا مگر ان سے اس بابت کسی گفتگو کی نوبت نہیں آئی اگر چہ ان کا ذکر ضرور آیا۔

ہمارے شہر لکھنؤ میں بھی ان کا ایک پروگرام ہوا اس کی بھی کچھ روداد سنی بھی اور پڑھی بھی اور اسی کے بعد انکی ایک سی ڈی کو بھی سننے کی نوبت آئی جو اردو میں تھی خصوصیت سے سوال و جواب کا حصہ سنا۔ جو باتیں سامنے آتی رہیں ان میں ان کے حق میں تاثرات کے ساتھ دوسری قسم کی باتیں بھی تھیں۔

ممبئی کے ایک سفر میں ان کے مرکز تک بھی جانا ہوا کہ اسکول دیکھیں مگر اس کی چھٹی تھی تو ان کا

دفتر اور اس کے متعلقات بھی دیکھے جو بے فائدہ نہ رہا۔

اسی عید کے بعد کی بات ہے کہ ایک ضرورت سے دہلی کا سفر ہوا تو جامع مسجد کے علاقے میں مکتبوں سے گذرتے ہوئے ایک جگہ ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اس حال میں مل گئے کہ مجھ جیسا آدمی ان کے افکار و نظریات سے براہِ راست مستفید ہو سکے اور وہ یوں کہ ایک مکتبہ میں ایک اسٹینڈ پر آویزاں ان کی چند چیزیں بزبان اردو نظر آئیں رک گیا۔ نظر ڈالی کچھ دیکھا، داعیہ ہوا کہ چیز مل رہی ہے تو خریدوں اور پڑھوں اور براہِ راست واقف ہوں۔

چیزیں تو کئی تھیں جو بڑا مجموعہ تھا اور جس میں اکثر دوسری مختصر و منفرد تحریریں شامل تھیں، اسی مجموعہ کو خریدا اور اسی سفر میں نقد مستفید ہوا اور اس مطالعہ و استفادہ کا حاصل آئندہ سطور میں پیش کیا جارہا ہے۔

حاصل مطالعہ پیش کرنے کے دو محرکات ہیں ایک تو یہ کہ حق تعالیٰ نے علم و دین کی خدمت میں کچھ اس طرح لگا رکھا ہے کہ لوگ سوالات کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کی بابت کیا رائے ہے؟ اور دوسرا محرک ہے الدین نصیحۃ۔

فی الوقت بہتر یہ سمجھا گیا ہے کہ قابلِ تبصرہ و قابل غور شائع شدہ چیز کو مِن و عن نقل کیا جائے اور مکمل عبارت و بات کے بعد ہی کچھ کہا جائے اور چند چیزوں کو ہی لیا جائے۔

دین کے کام کی نزاکت اور داعی حق کی پہچان

دین کا کام بڑا نازک اور بڑی ذمہ داری کا ہے اور ساتھ ہی بہت وسیع، بڑے پہلو اور شکلیں و صورتیں رکھتا ہے۔ اور اس عالم اسباب میں حق تعالیٰ یہ کام ہم انسانوں سے ہی لیتا ہے اور مشکلات و مسائل و آزمائشوں کے ساتھ مفید ثمرات و نتائج سے بھی سرفراز فرماتا ہے۔

اور عموماً یہ کام انہیں لوگوں سے لیا جاتا ہے جو خود مسلمان، ایماندار، دیندار، جو کچھ کہیں اس کے پاسدار ہوتے ہیں کہ خود بھی مانتے جانتے و کرتے ہیں بلکہ کہنے سے زیادہ کرنا و ماننا ان کے اندر ہوتا ہے، یہ اس لیے بھی ہوتا ہے کہ اسی کی وجہ سے دعوت میں روح و جان آتی ہے اور پھر یہ کہ کسی کام کی دعوت دینے والے اس کے صرف داعی نہیں بلکہ رہبر و مقتدا بھی ہوتے ہیں جو لوگ دعوت سے متاثر ہیں اس کو قبول کریں، وہ ان کو اپنا و بڑا معتمد و مقتدا مانتے ہیں اور وہ اس کو دیکھتے بھی ہیں کہ کہنے والا خود کس حد تک کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل اور ان کے سچے مخلصین و جانشین علماء و اہل اللہ گفتار سے بڑھ کر کردار کے حامل و غازی اور قول سے زیادہ فعل کے داعی ہوتے ہیں۔

لیکن اللہ کی ذات بڑی ہی بے نیاز ہے پھر اس کے کاموں میں بڑی بڑی مصلحتیں و حکمتیں ہوتی ہیں خواہ فوراً وہ ہمارے لیے کھلیں یا نہ کھلیں، وہ اپنے دین کا کام، حق و حقانیت کی طرف لوگوں کو لانے کا یا پھیلانے و مضبوط کرنے اور حفاظت کا کام ایسے لوگوں سے بھی لیا کرتا ہے کہ جو نہ صرف یہ کہ بسا اوقات علم کے ناقص اور عمل کے کمزور ہوتے ہیں، بلکہ یہ کہ وہ اپنے مذہب و عقیدہ کی رو سے اللہ کے باغی اور اس کے دین کے مخالف و دشمن یا اس سے انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔

جیسے کہ بسا اوقات ایسے لوگ جن کا دین و مذہب کھلے طور پر اللہ سے بغاوت اور اس کی ذات و صفات کے انکار کا ہوتا ہے۔ لیکن ان کا کردار و عمل بڑا پختہ ہوتا ہے اور بہت صحیح باتیں کرتے ہیں، حتیٰ کہ ان میں کسی قسم کی اخلاقی کمزوری و پستی نہیں ہوتی بلکہ اس اعتبار سے وہ انتہائی راستباز و

پاکباز اور حلال وحرام وغیرہ کی نسبت سے بڑے محتاط وپرہیزگار ہوتے ہیں، ان کے قول وفعل کی بنیاد پر ان کو غیر مسلم نہیں سمجھا و کہا جا سکتا۔ لیکن جب عقیدہ کی بات آتی ہے تو ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے سوا کسی دوسرے دین ومذہب سے وابستہ ہیں اور اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کسی کو مسلمان گرداننے کے لیے عمل کی درستگی کو دیکھنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے عقیدہ کو کریدنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح کسی کو حق کا داعی ماننے وقرار دینے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ اسلام کی باتیں کرتا ہے، قرآن وحدیث کی باتیں سناتا ہے، لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو باتیں وفکریں پیش کی جارہی ہیں قرآن وحدیث کے حوالوں سے اور آیات وروایات کے ذیل میں پیش کی جارہی ہیں؟ وہ باتیں کس حد تک قرآن وحدیث کے موافق ہیں؟

اور اس کا معیار یہ ہے کہ دین کے معروف ومسلمہ حقائق۔ جو صحابہ وسلف صالحین سے برابر منقول چلے آرہے ہیں اور جن کو امت کا سواد اعظم۔ عوام اور بالخصوص خواص مانتے چلے آرہے ہیں اور جن کی تفصیل وتوضیح فی الجملہ قرآن مجید اور معتبر روایات واحادیث میں موجود ہے۔ یہ دیکھا جائے کہ ان کی موافقت کس حد تک ہے؟

رسول اللہ ﷺ کو ماننے کے ساتھ ان کے خواص کا اتباع، صحابہ وتابعین اور ان کے بعد ان کے اقوال وافعال کے امین وشارحین علماء امت کی تشریحات وتوضیحات کو کیا حیثیت دی جارہی ہے؟ عقائد کے باب میں عام کتب عقائد میں اہل حق کے جو عقائد، مثلاً العقیدۃ الطحاویۃ وغیرہ میں ان کو کیا حیثیت دی جارہی ہے؟ کتاب وسنت کی توضیح میں عقل کو خادم مانا جارہا ہے یا حاکم وفیصل مانا جارہا ہے؟

صورت حال یہ ہے کہ اسلام سے منسوب افراد اور جماعتوں وتحریکات کا معاملہ یہ عہد صحابہ اور قرون اولیٰ سے یہ ہے کہ سب کتاب وسنت کی طرف اپنی اور اپنی فکروں کی نسبت کرتے ہیں اور

قرآن وسنت سے حسب موقع استفادہ بھی کرتے ہیں۔قرون اولیٰ کے معروف فرق......خوارج ،روافض، معتزلہ وغیرہ کا معاملہ ہو یا بعد کے اور حال کے ایسے افراد کا......جبکہ ان معروف فرق کا حال معلوم ہے تو صرف قرآن وحدیث کی زبان اور ان کی نسبت حق وحقانیت کی معرفت کا معیار نہیں بن سکتا۔

اور سامنے آنے والا تاثر وتاثیر بھی کافی نہیں اگر چہ اس کی وجہ سے کچھ اچھے نتائج بھی دکھائی دیں، بڑی معروف حدیث ہے جو صحیح بخاری میں بھی آئی ہے۔

''إن اللّٰہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر ''حق تعالیٰ اس دین کو کسی برے آدمی سے بھی طاقت پہنچاتا ہے (اور اس سے اس کی تائید کراتا ہے۔)

یہ بات آپ نے ایک خاص واقعہ کے تحت فرمائی ہے کہ ایک غزوہ میں ایک صاحب بڑے جی وجان سے جنگ کر رہے تھے، آپ کے سامنے تذکرہ آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ آدمی جہنمی ہے، لوگوں میں اس کا بڑا تاثر ہوا کہ بظاہر ایسا مخلص اور جہنمی ! کچھ لوگ پیچھے لگ گئے کہ اس کا حال دیکھیں ،وہ جنگ کرتے کرتے شدید زخمی ہوئے۔زخم کی شدید تکلیف میں انہوں نے اپنی ہی تلوار سے خودکشی کرلی، اس پر بعض لوگ بھاگ کر آئے اور آپ سے عرض کیا بلکہ یہ تک کہا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں کہ آپ کی بات سچ ثابت ہوئی، اس پر آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

کون مسلمان نہیں جانتا کہ نبی اکرم ﷺ کے چچا ابوطالب نے کس طرح اپنی سرپرستی کے ذریعہ نبی برحق اور دین حق کی نصرت کی۔اور اخیر میں دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے آبائی دین ومذہب پر جس پر نبی اکرم ﷺ تڑپ اٹھے۔اور سنیے کہ دوسرے شفیق چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو مشرف باسلام ہوئے لیکن ہجرت سے پہلے حضراتِ انصار سے جب ہجرت کے لیے بات چیت ہو رہی تھی تو یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے اور انصار سے کہہ رہے تھے کہ خوب سوچ سمجھ بڑی ذمہ داری لے رہے ہو۔یہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر کے قیدیوں میں تھے،انہوں نے سنا کہ مشورہ ہو رہا ہے کہ کفار کا لشکر تو تباہ ہوگیا، کیوں نہ

لپک کر اس قافلہ کو پکڑ لیا جائے جس کے لیے ہم لوگ نکلے ہیں، یہ قید کی حالت میں بولے: ایسا نہ کرنا کہ نصرت و فتح کا وعدۂ خداوندی لشکر اور قافلہ دونوں میں سے ایک جماعت کے لیے تھا اور ایک پر تم کو فتح حاصل ہوگئی، اس طرح انہوں نے ایک بڑے خطرے سے مسلمانوں کو بچایا۔

بہر حال ظاہر حال کسی بڑے فیصلے کے لیے کافی نہیں ہے۔ کسی کو حق کا داعی مان کر اس کو بنایا جاتا ہے کہ اس کی باتوں و تحقیقات پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس کے قول و فعل کو اسوہ و نمونہ مانا، بتایا و بنایا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ کچھ غور و فکر کیا جائے اور جائزہ لیا جائے انہیں باتوں کا جن کا تذکرہ کیا گیا۔

آج بہت سے لوگ دین کے داعی و ترجمان کی حیثیت سے آگے آ رہے ہیں، نمایاں ہو رہے ہیں ،لوگ ان سے متاثر ہو رہے ہیں، بعض کے پیچھے جم غفیر جا رہا ہے، چل رہا ہے اور جمع ہو رہا ہے۔ ہم کس کو مانیں کہ وہ صحیح چل رہا ہے اور صحیح سمت جا رہا ہے؟

ایک معروف حدیث ہے کہ کسی کے اخلاق کو جاننا ہو تو پڑوسیوں سے پوچھو اور یہ تو بہت معروف ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے لیے بہتر ہو۔ اور بھی ہدایات ہیں ان کی روشنی میں اس شناخت کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ متاثر ہونے والوں اور جمع ہونے والوں میں صحیح دینی شعور رکھنے والے کتنے ہیں اور دینی خدمات سے وابستہ معتبر لوگ کس حد تک؟ ایسے لوگوں کی دعوت ان کے فکر و خیال کے موافق ہے؟ اور اگر کچھ معتبر لوگ قریب ہیں تو ان سے معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے اور وہ کیوں قریب ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ کسی غلط فہمی، معلومات کی کمی یا کسی مصلحتِ مزعومہ کے تحت وہ قریب دکھائی دے رہے ہوں۔

داعی حق کے اوصاف

دین حق کے داعی کو سمجھنے اور پرکھنے کی چند موٹی موٹی باتیں

۱) دین فہمی کے لیے قرآن کریم کے ساتھ سنت پر اعتماد ہے کہ نہیں؟ یا یہ کہ صرف قرآن پر ہی اعتماد ہے اور سنت کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے؟

۲) قرآن فہمی کے لیے صرف اپنی فہم و عقل پر اعتماد ہے یا یہ کہ اس کے ساتھ لغات عرب کی پوری تحقیق، نیز آیات قرانیہ کی تشریح و توضیح میں جو معتبر احادیث محفوظ ہیں خواہ مرفوع ہوں نبی اکرم ﷺ سے منقول ہوں یا اکابر اہل علم صحابہ سے، اس کی بھی اہمیت اور اس سے بھی استناد ہے۔

۳) احادیث سے اسناد میں آیا کوئی مخصوص رخ و خیال ہے کہ صرف متواتر یا صرف صحیح احادیث یا صرف صحیحین حجت ہیں باقی ---نہیں--- یا یہ کہ جو بھی معتبر ذخیرہ ہے خواہ وہ غیر متواتر ہو اور خواہ وہ صحیح نہ ہو بلکہ حسن ہو اور صحیحین کے علاوہ دوسری معتبر کتابوں میں کیوں نہ ہو۔ وہ سب حجت و سند ہے۔

۴) حضرات صحابۂ کرام ؓ جو نبی اکرم ﷺ اور امت کے درمیان واسطہ ہیں۔ جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام حق تعالیٰ اور بندوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔ حضرات صحابۂ کرام کی بابت کیا خیال ہے، دین میں ان کا مقام و مرتبہ، نیز ان کے اقوال و افعال اور آثار کی حیثیت ہے؟ یا وہ عام انسانوں و مسلمانوں کے زمرے میں سمجھے جاتے ہیں اور " نحن رجال و هم رجال " کی بات کہی جاتی ہے؟

۵) حضرات تابعین سے لے کر اس عہد تک کے معتمد علی الامت بالخصوص قرون اولی کے سلف صالحین جنہوں نے دین متین کی ہر اعتبار سے خدمت کی اور حفاظت کی اور آگے تک پہونچایا، ان کے حق میں کیا نقطۂ نظر ہے؟ بالخصوص ائمہ اربعہ اور ان جیسے ممتاز حضرات۔

۶) عقل خادم ہے یا مخدوم کہ اصل عقل کو سمجھا جا رہا ہے اور اسی کے حدود و دائرہ میں دین کے سمجھنے و ماننے پر اصرار ہے یا یہ کہ اصل تو نقل و نص ہے جو اعتماد کے ساتھ ثابت ہو، عقل اس کی خادم ہے، ہوسکتا ہے کہ عقل سمجھے اور صحیح سمجھے اور ہوسکتا ہے کہ نہ سمجھے یا غلط سمجھے۔

لمحۂ فکریہ

آج کل بالخصوص ہمارے ملک میں دین کے داعی و ترجمان کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر نائیک

صاحب کا نام بہت نمایاں ہو رہا ہے، کافی لوگ سن رہے ہیں اور جڑ رہے ہیں اور ایسا بھی نہیں کہ ان کی ہر بات سو فیصد غلط ''خلاف شریعت'' اور خلاف کتاب وسنت ہے۔ لیکن ان کی تقریر و تحقیق میں کافی باتیں ایسی ہیں اور آرہی ہیں جو لمحۂ فکریہ ہیں اور جن کو گذشتہ تفصیلات کی روشنی میں دیکھنے وسمجھنے کی ضرورت ہے، ان کی جو چیزیں ہم کو ملیں ان کے مطالعہ سے ہم نے جو سمجھا وہ پیش خدمت ہے، لوگ خود جائزہ لے سکتے ہیں اور براہ راست سمجھ سکتے ہیں۔

۱) دین فہمی کے لیے قرآن کے ساتھ سنت کی اہمیت ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہے چنانچہ وہ آیات کے ساتھ روایات سے اپنی گفتگو کو مزین کرتے ہیں۔

۲) لیکن سنت واحادیث سے اسناد میں ان کا نقطۂ نظر وہ نہیں جو عام علماء امت کا ہے، جس کو بخاری کے مشہور شارح حافظ ابن حجرؒ نے اور ان سے پیشتر ابن صلاح وامام نوویؒ وغیرہ نے، نیز ان کے بعد کے حضرات نے لکھا اور اختیار کیا ہے کہ حدیث صحیح کے ساتھ حدیث حسن بھی حجت وسند ہے، بلکہ بعض مواقع وموضوعات میں حدیث ضعیف سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں ایک کتاب صحیح بخاری لکھی ہے جو اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث کا مجموعہ ومنتخب ہے، وہیں انہوں نے ''الأدب المفرد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ضعیف احادیث بھی کثرت سے آئی ہیں۔ جیسے کہ ترمذی وغیرہ میں ایسی حدیثیں کافی آئی ہیں اور ان پر عمل کا بھی تذکرہ آیا ہے۔

۳) قرآن فہمی میں ڈاکٹر صاحب کا اعتبار واعتماد صرف اپنی عقل وفہم پر ہے یا تھوڑا بہت لغت پر ہو سکتا ہے۔ ہم کو تو ان کے کلام میں معروف مواقع میں بھی روایات کا تذکرہ بھی نہیں ملا۔ اثار صحابہ تو دور کی بات ہے مرفوع ومعروف صحیح احادیث کا ذکر تک نہیں ہے اور لغات عرب کا مسئلہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ اس سلسلے کی بعض چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن خود ان کے ذکر وبیان سے واضح ہے کہ اس بابت ان کا علم ومعلومات بہت ناقص ہے، اتنا بھی نہیں جتنا کہ فضلاء مدارس کو عموماً ہوتا ہے۔

۴) علماء امت بشمول صحابہ و تابعین وائمہ مجتہدین وغیرہ کے بارے میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اس پہلو کی کوئی اہمیت نہیں، ہم نے ان کی تقریر و تحقیق پر مشتمل پانچ سو سے زائد صفحات جو پڑھے اور دیکھے ان میں متقدمین ومتاخرین کسی طبقے کے کسی عالم اور کسی کی کتاب کا شاید ہی کہیں کوئی تذکرہ ہو۔ ہاں، مقررین ومفکرین یا ڈاکٹر صاحب جیسے بعض حضرات کا ذکر وحوالہ ضرور مل سکتا ہے۔ کسی کسی جگہ علماء کا ذکر ہے۔ مگر نام کے بغیر علماء، اکثر علماء، بعض علماء وغیرہ، مگر کون؟ اس کا ذکر و تذکرہ نہیں۔

٦) ان کے بیان و جوابات سے یہ بھی صاف واضح ہوتا ہے کہ وہ عقل کو خادم نہیں بلکہ مکمل نہ سہی تو فی الجملہ اصل مانتے ہیں، اس لیے وہ عقل سے اور صرف اپنی عقل وفہم سے براہ راست کام لیتے ہیں اور کسی بھی مسئلے کا جواب دیتے ہیں اور کوئی بھی مسئلہ بے تکلف آیات سے نکال کر پیش کر دیتے ہیں اور آیات کو اس پر منطبق کر دیتے ہیں۔

یہ باتیں بڑی ذمہ داری کے ساتھ براہ راست ڈاکٹر صاحب کی چیزوں کو پڑھنے کے بعد اور سامنے رکھ کر کہی جارہی ہیں، اس بابت کچھ چیزوں کا انتخاب کر کے چند مضامین کی شکل میں مرتب بھی کیا گیا ہے اور اہل علم کی خدمت میں پیش کر کے ان کی تائید بھی حاصل کی گئی ہے۔ ان مضامین میں آنے والے منتخبات سے مذکورہ بالا امور واضح ہیں، مزید برآں بعض واضح اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

(۱) مسالک اربع پر غلط تبصرہ

ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں (ص ٦٦٠۔٦٦١):- ہمیں ائمہ اسلام کا احترام کرنا چاہیے جس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ کرام شامل ہیں۔ یہ سارے کے سارے بڑے عالم اور فقیہ تھے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی تحقیق اور محنت کا اجر نہیں عطا فرمائے۔ اگر کوئی شخص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد وروایات اور ان

کی تحقیق سے متفق ہوتا ہو تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ اسی سوال کے جواب میں مزید جو باتیں ڈاکٹر صاحب نے کہی ہیں ان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب چاروں مذاہب اور ان سے نسبت کو اسلام میں تفرقہ اور گروہ بندی مانتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

(ص: ۴۳۹) ''جب کسی مسلمان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کون ہو تو عموماً یہ جواب ملتا ہے کہ میں سنی ہوں یا شیعہ ہوں۔ اسی طرح کچھ لوگ اپنے کو حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی کہتے ہیں اور کوئی یہ کہتا ہے کہ میں دیوبندی یا بریلوی ہوں، ایسے لوگوں سے پوچھا جا سکتا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کیا تھے؟ کیا وہ حنبلی، شافعی، حنفی، یا مالکی تھے؟ بالکل نہیں؛ وہ اللہ کے تمام پیغمبروں جیسے ہی مسلمان تھے جو ان سے پہلے ہوئے''۔

اور ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔

(ص: ۴۴۱) ''حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی ﷺ نے تہتر فرقے بننے کی پیشین گوئی کی ہے مگر آپ ﷺ نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان فرقوں میں تقسیم ہونے کی کوشش کریں، جو لوگ قرآن اور حدیث کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں اور وہ فرقے نہیں بناتے اور نہ لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں وہی سیدھے راستے پر ہیں۔،،

اس کا مطلب تو بظاہر یہی ہے کہ چاروں مذاہب کے ماننے والے تفرقہ کا شکار ہو کر سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔

اس سوال و جواب کا آخری پیراگراف ملاحظہ ہو۔

(ص: ۴۴۲) ''قرآن کی بہت سی آیات یہ کہتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ ایک مسلمان کو قرآن اور صحیح حدیث پر عمل کرنا چاہیے، وہ کسی عالم یا امام سے متفق ہو سکتا ہے اس وقت تک جب تک کہ اس کے عقائد و نظریات قرآن اور صحیح حدیث کے مطابق ہوں اور اگر ان کے عقائد و نظریات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات اور سنت نبوی ﷺ کے خلاف ہوں تو ان کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے چاہے وہ کتنا بڑا ہی عالم یا رہنما کیوں نہ ہو۔ اگر تمام مسلمان قرآن ہی کو سمجھ کر اس کا مطالعہ کریں

اور صحیح حدیث پر عمل کریں تو ان شاء اللہ سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور مسلمان ایک متحد امت بن جائیں گے"۔

ڈاکٹر صاحب نے جس انداز میں اس پیرے کو اپنی سابق گفتگو سے جوڑا ہے اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک چاروں مذہب کے ماننے والے اللہ اور رسول کی اطاعت سے الگ ہیں۔

حدیث پر عمل کا معیار

پھر اس پیرائے میں قرآن کے ساتھ "حدیث" پر عمل کی بات کے بجائے صحیح حدیث پر عمل کی بات دو مرتبہ کہی گئی ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں صرف حدیث صحیح ہی قابل عمل ہے، اور دوسری احادیث اگرچہ وہ بھی اعتبار رکھتی ہوں وہ قابل عمل نہیں ہیں جبکہ عام علماء امت کا رجحان کچھ اور ہے جیسا کہ پیچھے لکھا جاچکا ہے اور یہ طے ہے کہ ہر مسئلہ میں صحیح حدیث پیش کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، جس کا جی چاہے تحقیق کرلے اور مطالعہ و جستجو کرلے۔

ابن القیمؒ جیسے صاحب نظر عالم نے لکھا ہے کہ چاروں اماموں میں سے ہر ایک کے بعض مسائل ضعیف احادیث پر مبنی ہیں، اور آج کل اہل حدیث حضرات نے نماز سے متعلق مسائل کی جو کتابیں لکھی ہیں آپ ان کا مطالعہ کریں تو ان کتابوں میں بھی ایک بڑی تعداد آپ کو احادیث ضعیفہ کی ملے گی۔ان کی سب سے معروف کتاب "صلوٰۃ الرسول" کی روایات کو ہی آپ دیکھ لیں۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تقریر "قرآن اور جدید سائنس" کے چند اہم اقتباسات اہلِ علم کی خدمت میں

میرے سامنے ڈاکٹر ذاکر صاحب کے خطابات کا سب سے بڑا مجموعہ ہے جو فرید بک ڈپو، دہلی کا شائع کردہ ہے۔اس کا پہلا خطاب سب سے مبسوط ہے اور عنوان بھی بڑا مضبوط ہے جو اوپر مذکور ہے۔

پورے خطاب میں آیات قرآنیہ مع ترجمہ ہیں اور سائنسی نظریات حوالہ جات کے ساتھ یا ان کے بغیر۔آیات کو موجودہ سائنسی نظریات کے ساتھ تطبیق میں پیش کیا گیا ہے۔قرآن فہمی یا تفسیر میں جو کچھ کہا

گیا ہے اس میں کہیں احادیث و روایات کا تذکرہ و حوالہ یا ان سے تعرض نہیں ہے۔ یا یوں کہیے کہ نبی اکرم ؐ، صحابہ ؓ یا علماء امت رحمھم اللہ سے کس آیت کی تفسیر میں کیا منقول ہے اس کا کوئی ذکر و تذکرہ نہیں ہے، کہیں لغوی معنی کو لیا گیا ہے مگر اپنے علم و فہم کے مطابق، نہ کہ مختار و معروف لغوی معنی، یا تفسیر و روایات کے مطابق۔

اس مضمون میں اس خطاب خاص کے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

(۲) زمین کی ہیئت کی تحقیق میں غلط استدلال، ص: 72-73

ا) زمین بالکل گیند کی طرح گول نہیں بلکہ ارضی بیضوی ہے یعنی یہ کہ یہ قطبین پر چپٹی ہے، مندرجہ ذیل آیت زمین کی شکل کی وضاحت کرتی ہے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ''اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا'' [سورۂ نزٰعٰت: ۳۰]

یہاں انڈے کے لیے استعمال کیا جانے والا عربی لفظ دَحٰهَا ہے، جس کا مطلب ہے شتر مرغ کا انڈا۔ شتر مرغ کا انڈا زمین کی شکل سے مماثلت رکھتا ہے، لہٰذا قرآن کریم مکمل درستگی سے زمین کی شکل کی وضاحت کرتا ہے، حالانکہ اس وقت جب قرآن اتارا گیا یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین چپٹی (FLAT) ہے۔

تحقیق و تبصرہ

ڈاکٹر صاحب نے دحٰھا، کے معنی انڈا اور شتر مرغ کا انڈا ذکر کیا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ''دحو'' کا لفظ و مادہ عربی زبان میں پھیلانے اور پھیلاؤ کا مفہوم رکھتا ہے، اسی کے مطابق دحٰھا کی تفسیر و ترجمہ زمین کو پھیلانے سے اور اس میں موجود اشیاء کے پیدا کرنے سے کیا گیا ہے جیسا کہ معروف ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر سورۂ والنزعات ج ۸ / ص ۳۳۹ طبع اشعب مصر) یہ لفظ و مادہ انڈے کے معنی میں نہیں آتا۔ میں نے لسان العرب سے مراجعت کی تو لفظ کی معنوی تفصیلات میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملا کہ یہ لفظ انڈے کے معنی میں آتا ہے البتہ یہ بات ملی جس کا ذکر راغب اصفہانی نے بھی کیا ہے کہ اُس مادہ

سے ایک لفظ ادحیہ ماخوذ ہے جو زمین کے اس حصے کے لیے بولا جاتا ہے جس میں شتر مرغ انڈا دیتا ہے اور اس پر بیٹھتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اس جگہ یا انڈے کو پھیلاتا و بڑھاتا ہے۔

(۳) چاند و سورج کی روشنی سے متعلق سائنسی نظریہ کی تصحیح کے لیے قرآن کی غلط تفسیر ص: 73-74

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا

(اور اللہ) بڑی برکت والا ہے جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں (آفتاب کا نہایت روشن) چراغ اور چمکتا ہوا چاند بھی بنایا [پارہ: ۱۹ رسورۃ الفرقان: ۳۰]

سورج کو عربی میں شمس کہتے ہیں، اسے سراج بھی کہا جاتا ہے جس کے معنی مشعل (Torch) کے ہیں یا بعض مواقع میں اسے ''وہاج'' یعنی جلتا ہوا چراغ کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، یہ تمام سورج کے لیے مناسب ہیں، کیونکہ سورج احتراق کے عمل کی بدولت روشنی اور حرارت مہیا کرتا ہے جبکہ عربی میں چاند کو قمر کہتے ہیں اور اسے قرآن کریم میں منیر کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے یعنی کہ وہ جسم جو کہ منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔

یہاں پر قرآنی لفظ چاند کی اصل ماہیت سے میل کھاتی ہے جو کہ خود روشنی نہیں دیتا بلکہ محض سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کسی بھی جگہ چاند کو سراج یا وہاج کے الفاظ سے نہیں پکارا گیا اور نہ ہی سورج کو نور یا منّور کے لفظ سے پکارا گیا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن سورج اور چاند کی روشنیوں کی نوعیت میں فرق روا رکھتا ہے...... لہٰذا قرآن کریم اور جدید سائنس سورج اور چاند کی روشنی کے فرق پر مکمل طور پر متفق ہیں۔

تحقیق وتبصرہ

سورج اور چاند دو الگ الگ چیزیں ہیں روشن و روشنی دینے والی جیسے یہ بدیہی ہیں دونوں کی روشنیوں کا فرق بھی بدیہی ہے، ہر ذی شعور محسوس کرتا ہے اور جانتا ہے کہ دونوں کی روشنی کی نوعیت و کیفیت میں فرق ہے اور تاثیر میں بھی، اور آج کی سائنس جس چیز کو بتا رہی ہے اس میں کوئی حرج

نہیں کہ اس کو مان لیا جائے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں، تاہم یہ کیا ضروری ہے کہ اسے قرآن کریم کے الفاظ و بیانات کا مدلول بھی مانا، بتایا اور ثابت کیا جائے، اس لیے کہ ایسے کسی دعویٰ کی تائید کے لیے جب کہ دعویٰ حصر اور تعین کے ساتھ ہو لغات عرب اور روایات دونوں یا دونوں میں سے کسی ایک کی تائید کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی علمی کمزوریاں

احقر کے علم کے مطابق کوئی روایت تو ہے نہیں، اب رہ گئی لغت عرب، تو وہ بھی اس کو نہیں بتاتی کہ شمس و سراج کے مفہوم میں خود، ذاتی طور پر جلنا اور قمر و نور کے مفہوم میں غیر ذاتی روشنی کے مزین ہونا داخل ہے، جبکہ لفظ نور قرآن کریم میں نہ جانے کتنی جگہ اور کتنے مواقع و مصداق میں استعمال ہوا ہے، حتیٰ کہ کسی کو حق تعالیٰ نے اپنے لیے بھی اس کو ذکر فرمایا ہے۔

اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ [پارہ:۱۸، سورۂ نور: ۳۵]

اور ایک موقع پر ''منیر'' کا لفظ جس کو ڈاکٹر صاحب نے اہم اور مدعا کی بنیاد بنایا ہے--- یہ لفظ سراج کے ساتھ بطور صفت کے استعمال ہوا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیۡرًا [پارہ:۲۲، سورۂ احزاب: ۴۵، ۴۶]

اس آیت کا تعلق نبی اکرم ا کی تعریف و توصیف سے ہے، آپ ا کو ''سراج منیر'' فرمایا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق لفظ ''سراج''، ''شمس و سورج'' سے مناسبت رکھتا ہے اور نہ یہ لفظ قمر کے لیے آیا اور نہ منیر کا لفظ سورج کے لیے آیا۔ اور آیت مذکورہ میں منیر کا لفظ سراج کے ساتھ آیا ہے اور مفسرین نے اس کا مفہوم ''روشن سورج'' کا ذکر کیا یعنی ہدایت کا روشن سورج بنایا۔

[تفسیر ابن کثیر: ج۶/۴۳۱]

(۴) آیت کی غلط تخصیص ص 79 پلازما یعنی بین النجوم مادہ

پہلے یہ خیال عام تھا کہ منظم فلکیاتی نظام کے باہر صرف خلا (Vaccum) ہے، فلکی طبعیات کے ماہرین نے بعدازاں اس درمیانی خلا میں ''مادے کے پل'' دریافت کیے، مادے کے یہ پل پلازما کہلاتے ہیں، قرآن پاک اس آیت میں ستاروں کے درمیان موجود مادے کی طرف اشارہ کرتا ہے، اِلَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَا ''وہ جس نے آسمانوں کو پیدا کیا۔ اور زمین کو اور جواُن کے درمیان ہے۔'' [پارہ:۱۹، سورۃ الفرقان:۵۹]

تحقیق وتبصرہ

ڈاکٹر صاحب نے کس فہم کی بنیاد پر اتنا بڑا دعویٰ کیا یا اس دعویٰ سے آیت مذکورہ کو جوڑا، تعجب خیز ہے، آیت میں نجوم وستاروں کا کوئی ذکر نہیں جبکہ آیت کا آخری ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے۔ پوری آیت ہے۔ الذی خلق السموات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام۔

آیت کا مقصود ومضمون چھ دنوں کے اندر پوری کائنات، زمین تا آسمان، آسمان تا زمین کے پیدا کرنے کو بتانا ہے، اس لیے وَمـا بینھـما کا واضح ترین مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ زمین وآسمان کے درمیان جو کچھ ہے، سورج، چاند، ستارے، خلا وفضا، اور زمین کے جسم کے متصل اشیاء سب کی پیدائش کل چھ دن کی مدت میں ہوئی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے دوسرے مواقع میں بھی ذکر کیا ہے۔

(۵) پھیلتی ہوئی کائنات کے سائنسی نظریہ کے اثبات پر آیت کی بے جا تفسیر ص:۸۰۔

1925ء میں امریکی ماہر فلکیات EdwinHubble نے مشاہداتی ثبوت مہیا کیا کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹتی جارہی ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے، کائنات کا پھیلتے جانا اب ایک واضح سائنسی حقیقت ہے اور یہی وہ بات ہے جو کائنات کی کیفیت کے بارے میں قرآن بیان کرتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ

ترجمہ: اور ہم نے آسمان کو بنایا قوت سے اور بیشک ہم وسیع القدرت ہیں

[پارہ: ۲۷ سورۃ الذاریات: ۴۷]

عربی لفظ موسعون کا درست ترجمہ پھیلا رہے ہیں بنتا ہے اور یہ پھیلتی ہوئی کائنات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تحقیق وتبصرہ

عربی کا لفظ وسعت، قدرت وطاقت اور کشادگی کے معنی بھی رکھتا ہے، سیاق وسباق، موقع و محل کے کسی معنی ومفہوم کی تعین ہوتی ہے، یہاں آیت کا موقع قدرت ہی کے مفہوم کا ہے، خود ڈاکٹر صاحب کا نقل کردہ ترجمہ ''وسیع القدرت'' ہے پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے اس آیت کو ایک سائنسی نظریہ سے جوڑ دیا ہے جس کا کتاب وسنت میں تو کوئی تذکرہ نہیں ہے اور نہ اس مفہوم کا کسی مفسر نے تذکرہ کیا ہے۔ (میرے سامنے تفسیر حاوی ہے جس میں صحابہ وتابعین وغیرہ کے تفسیری اقوال جمع کیے گئے ہیں۔ جلد چہارم ص ۱۰۶۔ سورۂ ذاریات آیت مذکورہ کے تحت چند اقوال ہیں سب کا قدر مشترک قدرت وطاقت ہے یا یہ کہ اتنا بڑا یا اس سے بڑا یا اس جیسا آسمان ہم بنا سکتے ہیں۔

راغب اصفہانی نے بھی اسی مفہوم کا تذکرہ کیا ہے۔ اور تفسیر ابن کثیر (ج: ۸، ص: ۴۰۱، ۴۰۲ طبع الشعب مصر) میں بھی یہی آیا ہے کہ ہم نے آسمان کو خوب پھیلایا ہے اور بغیر ستونوں کے اس کو بلند کیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک شرعی وفقہی مسائل واحکام سے متعلق

میرے سامنے نائک صاحب کا وہ خطاب ہے جو ''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' کے موضوع پر ہے اور ان کے مجموعۂ خطبات میں تیسرے نمبر پر ہے، اس خطاب کے سوال وجواب والے حصے سے نیز سوال وجواب کا جو مستقل جزو ہے اس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں البتہ تمہیداً ''عورتوں کے حقوق'' رسالے سے ایک ٹکڑا۔ اہل علم کے لیے پیش خدمت ہے۔

(۶) مغربی نظریہ مساوات کی تائید اور آیتِ قرآنی کی من مانی تفسیر وترجمانی، ص:295، سطر:۴ر تا ۱۱ر۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ [پارہ:۵، سورۂ نساء، :۳۴]

لوگ کہتے ہیں کہ لفظ ''قوام'' کا ایک درجہ اوپر ہونے کے ہیں لیکن اصل میں لفظ قوام اقامہ سے نکلا ہے، اقامہ کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ نماز سے پہلے اقامت کہتے ہیں آپ کھڑے ہو جاتے ہیں، لہٰذا اقامہ کا مطلب کھڑا ہونے کے ہیں، لہٰذا لفظ ''اقامہ'' کا مطلب ہوا کہ ایک درجہ ذمہ داری میں اونچا ہے نہ کہ فضیلت میں۔''

تحقیق تبصرہ

عبارت تو ناظرین دیکھ لیں، مقصد یہ ہے کہ مرد کچھ ذمہ داری زیادہ رکھتا ہے افضل نہیں ہے، اہل مغرب کے دعوی مساوات کو اسلام سے ثابت کرنے اور بتانے کے سیاق میں یہ بات آئی ہے اور جس انداز میں ''قوام'' پر گفتگو اور اقامت نماز سے استدلال ہے وہ قابل توجہ ہے۔

نوٹ : ڈاکٹر صاحب کی عبارت ''ذمہ داری میں اونچا ہے'' فضیلت کا اثبات کر رہی ہے، جبکہ فضیلت کی نفی کا دعوی ہے، اس طرح کے تضادات ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں عام ہیں۔

(۷) عورت کے لیے حق طلاق اور طلاق کی نئی دریافت، ص:360۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر مرد طلاق دے سکتا ہے تو کیا عورت بھی طلاق دے سکتی ہے؟

جواب : عورت طلاق نہیں دے سکتی کیونکہ طلاق عربی کا لفظ ہے اور جب ہی استعمال ہوتا ہے جب کوئی مرد اسے عورت کے لیے بولتا ہے لیکن عورت طلاق دے سکتی ہے۔

اسلام میں پانچ قسم کی طلاق ہے

۱۔ پہلی قسم بالرضا ہے جو کہ شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتی ہے اور دونوں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے درمیان، ہم آہنگی ممکن نہیں لہٰذا جدا ہو جاتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم یکطرفہ مرضی پر ہے جو کہ طلاق کہلاتی ہے جس میں کہ اسے حق مہر ادا کرنا ہوتا ہے، اگر اس نے ادا نہیں کیا ہوا تو اسے کرنا پڑے گا۔ تحائف سمیت جو کہ اس نے دیے ہوئے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم بیوی کی یکطرفہ مرضی پر ہے اگر وہ اپنے نکاح نامے میں اس کا ذکر کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے نکاح نامے میں (Mention) کرتی ہے کہ اسے طلاق دینے کا حق ہے تو وہ اسے دے سکتی ہے یہ ''رسماً'' کے طور سے جانا جاتا ہے میں نے آج تک کسی کو ''رسماً'' کے متعلق بولتے نہیں سنا، یہ ''رسماً'' کہلاتا ہے یعنی کہ عورت طلاق دے سکتی ہے۔

۴۔ چوتھی قسم یہ کہ اگر شوہر اسے مارتا پیٹتا ہے یا مساوی حقوق نہیں دیتا تو یہ اسے یہ اختیار ہے کہ وہ قاضی کے پاس جائے جو کہ نکاح کو فسخ کر دے، یہ نکاح فسخ کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق قاضی شوہر کو حکم دے سکتا ہے کہ وہ اسے پورا حق مہر دینے کا پابند ہے یا مہر کا کچھ حصہ، یہ قاضی پر منحصر ہے۔

۵۔ پانچویں اور آخری قسم خلع کی ہے کہ اگر شوہر بہت اچھا بھی ہے اور بیوی کو اس کے خلاف کوئی شکایت بھی نہیں لیکن اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہیں کرتی تو وہ شوہر سے درخواست کر سکتی ہے کہ وہ اسے طلاق دیدے اور یہ خلع کہلاتا ہے۔

لیکن بہت کم لوگ عورت کے طلاق دینے کی بات کرتے ہیں۔ علماء نے طلاق کی پانچ اقسام رکھی ہیں، کچھ ایک دو اور تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں لیکن تمام طریقۂ عمل پانچ طلاق کی قسموں والا بھی ہے، میرا خیال ہے کہ سوال کا جواب ختم ہوا۔

تحقیق وتبصرہ

ڈاکٹر صاحب نے طلاق کی جو پانچ اقسام ذکر کی ہیں۔ ان پر نمبر ڈالنے اور الگ الگ کر کے لکھنے کا کام ہم نے کیا ہے، بقیہ من وعن ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذکر کردہ تفصیل میں اگر تفصیل میں جایا جائے تو بہت دکھ ہے۔ ہم مختصراً ہی کچھ ذکر کریں گے۔

ا۔ طلاق کی پانچ اقسام...... ڈاکٹر صاحب نے یہ تفصیل کہاں سے اور کس سے لی ہے؟ انہوں

نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ علماء کا ذکر تو کیا مگر نام نہیں لیا، اس لیے حوالہ انہیں سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ہماری جو معلومات ہیں اور جو حاصل بھی کیں ان میں اس انداز کی تفصیل کہیں نہیں ہے۔ اس وقت کی سب سے مبسوط اور چاروں فقہی مذاہب کے معروف معتمد اقوال پر مشتمل کتاب ''الموسوعة الفقهية'' ہے جس کو ۴۵ رجلدوں میں کویت کی وزارة الأوقاف نے شائع کیا ہے، اس کی ۲۹رویں جلد ہمارے سامنے ہے۔ اس میں طلاق کی تفصیل ہے، شروع بحث میں طلاق اور اس سے متعلق الفاظ کے ذکر کے ساتھ (ص:۵ تا ۸) اور اسی طرح طلاق کی اقسام کی تفصیل میں (ص:۲۶ و مابعد) ڈاکٹر صاحب کی مذکورہ پانچ اقسام کا مذکورہ تفصیلات کے ساتھ کوئی ذکر و تذکرہ موجود نہیں ہے۔

اس وقت کی ایک معروف مبسوط و مستند فقہی کتاب ''الفقه الاسلامی و أدلته'' ہے جس کے مصنف عالم اسلام کے معروف وھبـــہ زحیلی ہیں اور یہ چاروں مذاہب کے علاوہ بعض دوسرے کا مذاہب کی تفصیلات پر بھی مشتمل ہے۔ اس میں بھی طلاق اور اس کی اقسام کے بیان میں اِس مضمون کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

۳۔ طلاق نکاح کے بعد اور منکوحہ کو ہی ہوتی ہے اور ایک منکوحہ عورت بغیر طلاق یا باضابطہ علیحدگی وتفریق کے بغیر نیا نکاح نہیں کرسکتی، خواہ کیسے ہی حالات ہوں اور مجبوری ہو۔ مخصوص حالات کا حل شریعت نے رکھا ہے اور کتب فقہ میں موجود ہے۔

۴۔ طلاق کا حق۔ استقلالاً صرف اور صرف اسی مرد کو ہے جس سے کسی عورت کا رشتۂ ازدواج ہوتا ہے حتی کہ اس صورت میں بھی جبکہ ایک باپ اپنے نابالغ بیٹے کے لیے ایجاب وقبول کر کے نکاح کرتا ہے، طلاق دینے کا حق باپ کو نہیں بلکہ اسی نابالغ بیٹے و شوہر کو ہے اور یہ حق بھی اس صورت میں اُس کو بعد البلوغ ہے۔

۵۔ نکاح کرنے والے مرد کے سوا کوئی دوسرا عاقل و بالغ آدمی نکاح کرنے والے کی نیابت میں اس کی طرف سے طلاق واقع کرنے یا علیحدگی کا حق رکھتا ہے، خواہ یہ نیابت خود نکاح کرنے

والے نے دی ہو یا اس سے حاصل کی گئی ہو یا شریعت نے اس کی اجازت دی ہو لیکن شریعت کی اجازت صرف قاضی کے لیے ہے۔ نہ حَکَم کے لیے بھی اس وقت ہے جبکہ حکم کو شوہر کی طرف سے یہ حق دیدیا گیا ہو۔

۶۔ عورت کو اصلاً و استقلالاً طلاق کے ایقاع یا رشتہ کے ختم کرنے کے اقدام کا حق نہیں ہے۔ البتہ وہ شوہر سے اس مطالبہ کا حق رکھتی ہے۔

۷۔ عورت کو اپنی مرضی سے طلاق واقع کرنے کا حق صرف اس صورت میں ہے جبکہ شوہر کی طرف سے اُس کو یہ حق دیدیا گیا ہو، شوہر نے خود دیا ہو یا عورت نے اس سے کہہ کر حاصل کیا ہو، اور نکاح کے وقت ہی یہ حق حاصل کرلیا گیا ہو یا بعد میں؛ بہر حال عورت کو شوہر کی طرف سے اگر یہ حق مل جائے تو اس صورت میں وہ محض اپنی مرضی وصوابدید سے اس حق کا استعمال کر کے رشتہ کو ختم کر سکتی ہے۔

۸۔ شوہر کی رضا سے عورت کو حاصل ہونے والے حق تفریق کی مختلف شکلیں وصورتیں ہیں جو کتب فقہ وحدیث میں معروف ہے، فقہ وحدیث کی شاید ہی کوئی تفصیلی کتاب ہو جس میں اس حق اوراس کی تفصیلات کا تذکرہ نہ ہو، بعض صورتوں کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ سورۂ احزاب سورت نمبر ۳۳ ر آیت ۲۸ ر کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔ جس میں حضرات ازواج مطہرات سے خطاب اور ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے۔

۹۔ ڈاکٹر صاحب کی ذکر کردہ پانچ اقسام وتفصیلات میں بعض باتیں وہ ہیں جو معروف ومتفق علیہ احکام وتفصیلات کے خلاف ہیں؛ ایک تو یہ کہ انہوں نے مہر کی ادائیگی کا ذکر صرف دوسری صورت میں کیا ہے اور چوتھی میں یہ ذکر کیا ہے کہ مہر کتنا ادا کرنا ہے، یہ قاضی کے فیصلہ پر ہے یہ بات چند وجوہ سے قابلِ غور ہے۔

(الف) جبکہ صورت یہ ہے کہ نکاح کے ساتھ مہر کا تعلق لازم وملزوم ہے۔ حتی کہ نکاح ہوا

اور کچھ طے نہیں ہوا اور ملاقات وصحبت کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ رشتہ ختم ہو گیا تو اس صورت میں بھی مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔ مہرِ مثل یا متعہ کے نام وعنوان سے نصف مہر مثل کے مساوی، اور طے ہونے کی صورت میں کل طے شدہ یا نصف ادا کیا جاتا ہے۔ نکاح کے بعد فرقت ہو اور شوہر پر کچھ نہ ہو؛ یہ صرف اس صورت میں ہے کہ عورت صراحتاً حقِ مہر معاف کر دے یا ایک دو صورتیں اور ہیں جو شاذ و نادر کے درجے میں ہیں۔ بہر حال مہر ایک حق شرعی ہے جو وجود نکاح اور صحت نکاح کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور شوہر کو کسی نہ کسی صورت میں عموماً اسے ادا کرنا ہی ہوتا ہے اس لیے ڈاکٹر صاحب دوسری اور چوتھی کے ساتھ تخصیص کرنا تجدید شریعت یا تحریفِ شریعت کے مرادف ہے۔

(ب) اور مہر کی مقدار کیا ہو گی اس کو نکاح ہو جانے کے بعد کسی کی مرضی وصوابدید پر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس کا نظام شریعت کی طرف سے طے شدہ ومقرر ہے، ایجاب وقبول میں جو طے ہوا وہ...... یا اس کا نصف اور اگر ایجاب وقبول میں طے نہیں ہوا تو بعد میں زوجین جو طے کر لیں...... یا مہر مثل اور اس کا نصف...... اس میں ردّ وبدل کم وبیش کا حق واختیار اگر ہے تو زوجین ہی کو...... کہ بیوی کو ملنا ولینا ہے اور شوہر کو ادا کرنا ودینا ہے...... حتیٰ کہ نکاح کے انجام پا جانے کے بعد پھر معروف قول کے مطابق اولیاء کا بھی کوئی حق واختیار نہیں رہ جاتا۔ قاضی کو حالات کے تحت رشتہ کے ختم کرنے یا کرانے کے فیصلہ کا حق تو ہے مگر مہر میں ردّ وبدل یا کچھ طے کرنے کا حق نہیں ہے۔

۱۰) پانچ اقسام کے تعارف میں ذکر کردہ تفصیلات بھی محل نظر ہیں فسخ وخلع کے صرف وہ اسباب نہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نہ ہی باہمی رضا وبات چیت کے ساتھ اس طرح طلاق وفرقت ہوتی ہے جس طرح ذکر کیا گیا ہے، شریعت نے اس بابت کچھ ضابطے، اور الفاظ متعین کیے ہیں ان کی رعایت بھی رکھنی ہوتی ہے اور اسی کے مطابق احکام کا ترتب ہوتا ہے۔

نوٹ : مہر وطلاق سے متعلق اس نئی دریافت کا ماخذ کون سی شریعت ہے ذاکر نائیک صاحب اس کا جواب دیں۔

(۸) مرد وعورت کی گواہی میں فرق یا مساوات، ص:409، سوال:9۔

سوال: اسلام میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں ہے؟

جواب: اسلام میں دو عورتوں کی گواہی ہمیشہ ایک مرد کے برابر نہیں ہے، قرآن مجید کے اندر تین مقامات پر مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر گواہی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

وراثت کے بارے میں وصیت کے وقت دو عادل گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ مائدہ:۵، آیت:۱۰۷ میں قرآن کہتا ہے۔ ترجمہ......

اور طلاق کے بارے میں دو عادل کو گواہ بنانے کا حکم ہے، سورۃ طلاق سورۃ:٦۔ آیت:۲، میں......................

اسی طرح پاکدامن عورتوں کے بارے میں گواہی کے لیے چار لوگوں کی شہادت کی ضرورت ہے جیسے کہ سورۃ نور سورہ نمبر۲۴ آیت نمبر چار میں ہے کہ..........

یہ بات درست نہیں ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ہمیشہ ایک مرد کے برابر ہوگی، یہ صرف چند مخصوص معاملات میں ہے، قرآن کے اندر پانچ آیات ایسی ہیں جن میں گواہی کے معاملے میں مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر حکم موجود ہے اور صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔ یہ سورۃ بقرہ سورۃ نمبر۲ آیت نمبر۲۸۲ میں ہے اور مالی معاملات میں قرآن کی یہ سب سے لمبی آیت ہے......

قرآن کی یہ آیت صرف مالی معاملات کے لیے ہے اور اس قسم کے معاملات میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معاہدہ دونوں فریقوں کے درمیان لکھ لیا جائے اور اس کے دو گواہ بنا لیے جائیں اور یہ کوشش کی جائے کہ وہ صرف مرد ہوں اور اگر مرد نہ مل سکیں تو ایسی صورت میں ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ اسلام میں مالی معاملات میں دو مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے، اسلام مرد سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ خاندان کی کفالت کریں۔

چونکہ اقتصادی ذمہ داری مرد کے اوپر ہے اس لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مالی معاملات میں عورتوں کی نسبت زیادہ معلومات رکھتا ہے، دوسری صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ کرنا ہوگا اور اگر ایک عورت بھول جائے یا غلطی کرے تو دوسری اسے یاد دلا دے، قرآن میں عربی کا لفظ تَضِلَّ کا معنی ہے غلطی کرنا یا بھول جانا۔ صرف مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔

اس کے برخلاف کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کی گواہی قتل کے بارے میں بھی دوہری ہے یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے، ایسے معاملات میں ایک عورت مرد کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی جذباتی حالت کی وجہ سے پریشان ہو سکتی ہے، اس لیے بعض لوگوں کے نزدیک قتل جیسے معاملات میں بھی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے، کچھ علماء کے نزدیک دو عورتوں اور ایک مرد کی گواہی تمام معاملات میں ہے اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ سورۂ نور سورہ نمبر ۲۴ آیت نمبر ۶۔تا ۹ میں ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی کے بارے میں واضح حکم موجود ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو ہمارے نبی ا کی بیوی تھیں، ان سے کم و بیش ۲۲۲ کے احادیث مروی ہیں جو صرف ان کی اکیلی شہادت کی وجہ سے مستند ہیں، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ایک عورت کی گواہی بھی قابل قبول ہے۔

بہت سے علماء اس بات پر بھی متفق ہیں کہ رویت ہلال یعنی چاند کے دیکھنے کے بارے میں بھی ایک عورت کی گواہی کافی ہے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ روزے جیسی عبادت میں جو اسلام کے اہم ارکان میں سے ہے کے لیے بھی ایک عورت کی گواہی کافی ہے اور اس گواہی پر تمام مسلمان روزہ رکھتے ہیں، کچھ علماء کے نزدیک روزے کے آغاز کے لیے ایک، جبکہ اس کے اختتام کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہے اور اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ گواہ مرد ہوں یا عورت۔

بعض ایسے معاملات بھی ہیں جن میں صرف ایک عورت کی ہی گواہی کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً عورتوں کے مسائل میں عورت کو دفن کرنے کے لیے اس کو غسل دینا۔ ایسے معاملات میں مرد کی گواہی

قابل قبول نہیں، مالی معاملات میں عورت اور مرد کے درمیان نظر آنے والا یہ فرق کسی عدم مساوات کی بنیاد پر نہیں بلکہ یہ صرف معاشرے میں ان کی مختلف نوع کی ذمہ داریوں اور کردار کی وجہ سے ہے جو اسلام ان کے لیے متعین کرتا ہے۔

(ڈاکٹر صاحب کی عبارت سے آیات کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔)

تحقیق وتبصرہ

ڈاکٹر صاحب کی اس تفصیل میں کچھ صحیح کے ساتھ کیا کیا خلط وخلل ہے اس کی تفصیل کی جائے تو وہ بڑی طویل ہوگی۔

۱۔مختصراً یہ کہ اسلام کا قانون شہادت و نظام شہادت، اساسی طور پر قرآن مجید میں اور تفصیل سے کتب حدیث و کتب فقہ میں موجود ہے، اہل علم خوب واقف ہیں اور کتابیں خوب دستیاب ہیں، مختلف زبانوں میں، پڑھنے والے کتابوں کے واسطے سے شہادت کی بابت شریعت کی تفصیلات سے واقف ہوسکتے ہیں اور پھر خود فیصلہ کرلیں۔اہل انصاف اہل نظر کا فیصلہ ذکر کردہ مختلف امور میں یہی ہوگا کہ کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑا ہے اور وہ یہی کہیں گے۔ ع ببیں تفاوت راہ از کجا تا بکجا

۲۔اور مختصراً نیز معتمد و مستند شرعی تفصیل سے واقف ہونے کے لیے عرض ہے کہ احقر کے سامنے ایک کتاب ''الفقہ الاسلامی واَدلتہ'' ہے جو عالم اسلام کے ممتاز فقیہ وھبہ زحیلی کی ہے اور جس میں چاروں معروف فقہی مذاہب کے علاوہ مزید مذاہب کا بھی لحاظ وخیال کیا گیا ہے جن میں ظاہریہ بھی ہیں جن سے اہل حدیث حضرات کی عموماً موافقت پائی جاتی ہے۔

اس کتاب کی آٹھویں جلد میں قضا وغیرہ کے مسائل کے ساتھ شہادت کی تفصیلات موجود ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کی ذکر کردہ برجستہ تفصیل سے موافقت نہیں رکھتیں.........

دوسری کتاب ہے ''الموسوعۃ الفقھیہ'' جو کویت حکومت کی شائع کردہ ہے، اس میں چاروں مذاہب پر ہی انحصار ہے، اس کی چھبسویں جلد میں شہادت کا مضمون اور اس کی تفصیل آئی ہے اور وہ

بھی مذکورہ تفصیل سے موافقت نہیں رکھتی، اسی کتاب سے چند باتیں نقل کی جاتی ہیں۔

۳۔ ''الموسوعۃ الفقھیہ'' ج ۲۶ ص ۲۲۶۔تا ۲۳۰ میں نصاب شہادت کا تذکرہ ہے، تمہید میں یہ کہا گیا ہے کہ گواہوں کی تعداد شہادت کے موضوع کے اعتبار کے مختلف ہوتی ہے (اس کے بعد مذکور ہے)

ا: بعض شہادتوں میں چار سے کم مرد مقبول نہیں اور ایک بھی عورت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ زنا میں ہے۔

ب: کوئی مالدار آدمی اپنے فقر کا دعویٰ کر کے اگر زکاۃ کے استحقاق کی بات کرے تو حنابلہ کہتے ہیں کہ تین مردوں کی گواہی درکار ہے۔

ج: بعض معاملات میں دو گواہ مگر صرف مرد قبول کیے جاتے ہیں، یہ زنا کے علاوہ تمام حدود میں ہے، اور اس پر سب فقہا متفق ہیں۔

اور جمہور فقہا کی رائے ہے کہ جن معاملات سے عموماً مرد واقف ہوتے ہیں اور وہ مال سے تعلق نہیں رکھتے جیسے نکاح، طلاق، رجعت، ایلاء، ظہار، نسب، اسلام، ارتداد، جرح، تعدیل، موت ، یا تنگ دستی، وکالت، وصیت، شہادت پر شہادت وغیرہ ان کا ثبوت دو گواہوں سے اور صرف مرد گواہوں سے ہوتا ہے۔

د: حنفیہ کا کہنا ہے کہ حدود و قصاص کے ماسوا جملہ معاملات خواہ مالی ہوں یا غیر مالی ان میں دو مرد گواہ۔ یا ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ جبکہ جمہور نے ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی صرف ایسے معاملات میں رکھی ہے جو خالص مالی ہوں۔

ھ: بعض معاملات میں صرف عورتوں کی گواہی مقبول ہے جیسے ولادت، رضاع اور وہ معاملات جن سے اجنبی مرد واقف نہیں ہوتے یعنی عموماً۔

البتہ عورتوں کی تعداد کیا ہوگی۔ ایک یا زیادہ اور حکم عام ہے یا تفصیل ہے، اس میں اختلاف

ہے۔تفصیل میں ایک، دو، تین، چار عورتوں کی بات آئی ہے۔

و: بعض معاملات میں صرف ایک گواہ کافی ہوتا ہے جو عادل و معتبر ہو، خواہ مرد ہو یا عورت جیسے رمضان کا چاند۔

۴۔ چاروں اماموں کے نزدیک یہ معتبر تفصیلات ہیں، اس کے مطابق معاملات کا ایک حصہ وہ ہے کہ جس میں عورت بحیثیت شاہد مقبول ہی نہیں ہے۔ اور کچھ معاملات ہیں جن میں عورت بحیثیت شاہد مقبول ہے۔ پھر جہاں وہ مقبول ہے وہاں بھی ایک قصہ میں تن تنہا شاہد بن سکتی ہے ورنہ اسے دوسری معاون و مددگار کی ضرورت ہوتی ہے۔ قتل وغیرہ معاملات میں اکیلی و دکیلی کیا سرے سے مقبول ہی نہیں اور جن آیتوں سے ایسے معاملات میں ڈاکٹر صاحب نے وسعت نکالی یا سمجھی ہے جمہور علماء امت کے نزدیک وہاں آیات کا مدلول اور حکم شرعی اس کے برخلاف ہے۔ زنا کے علاوہ دیگر حدود میں ظاہر یہ ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی گواہی کو درست قرار دیتے ہیں۔ (الفقہ الاسلامی ۸/۶۰۴۵)

(۹) باپ کی ولایت کا مطلب

(اقتباس از عورتوں کے حقوق کے بیان میں) ص:367۔

سوال: اسلامک پرسنل لا (Islamic Personal law) کے تحت صرف باپ ہی اپنی اولاد کا ولی کیوں ہے؟

جواب: بہن نے پوچھا ہے اسلامی قانون کے مطابق صرف باپ ہی کو نیچرل گارڈین کا حق حاصل ہے- یہ غلط ہے بہن، اسلامی شریعت کے مطابق اگر بچہ اپنی ابتدائی نشوونما میں ہے- زیادہ سے زیادہ سات سال تک- اگر وہ اس سے کم ہے تو گارڈین شپ (حفاظت) کی ذمہ داری کا حق ماں کو جاتا ہے کیونکہ ماں کی ذمہ داری باپ سے زیادہ ہے شروع کے Stage میں، اس کے بعد باپ گارڈین ہوتا ہے اور جب وہ میچور ہو جائے تو یہ بچہ کی اپنی آزادانہ مرضی ہوگی کہ وہ جس کے ساتھ مرضی

(ہو) رہے، لیکن اس دوران اسلام کہتا ہے کہ بلا تخصیص اس کے کہ بچہ باپ کے ساتھ ہے یا ماں کے ساتھ اس کو دونوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ میرا خیال ہے کہ سوال کا جواب ہوا۔

تحقیق وتبصرہ

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات کو (میرا خیال ہے کہ سوال کا جواب ہوا) کہہ کر ختم کر دیا اور اپنی دانست میں جواب دے دیا اور سائل کو مطمئن کر دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ سوال و جواب میں مطابقت ہی نہیں ہے۔

۲۔ حق یہ ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے والدین پر بچے کے دو قسم کے حق ہیں، ایک حق ولایت اور دوسرے حق حضانت، یہ دو الگ الگ حق ہیں، حق حضانت کا تعلق بچہ کی پرورش و پرداخت، اور یوں کہیے کہ بچپن کے حال کی بچہ کی خدمت سے ہے، اور ولایت بچے کی نگہداشت اور اس کے اخراجات و دیگر امور کی ذمہ داری۔

حق ولایت بالاتفاق باپ کا ہے جبکہ باپ موجود ہو، وہ نہیں تو دادا وغیرہ کا ہوتا ہے اور یہ پیدائش سے لے کر بلوغ تک ہے۔ بالغ ہونے کے بعد یہ حق خود بچے کو حاصل ہو جاتا ہے اگر عاقل بھی ہو، اور یہ بھی لڑکے کی بات ہے اور لڑکی میں تو بلوغ کے بعد بھی بعض امور (مثلاً نکاح) میں حق ولایت باپ کا ہی رہتا ہے (اگر چہ اس میں تفصیل واختلاف بھی ہے۔) حق ولایت عورتوں کو حتیٰ کہ ماں کو بھی کم از کم باپ کی موجودگی میں حاصل نہیں۔

اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ حق بھی دو حصوں میں ہے، ایک حق کفالت، خرچ واخراجات کی ذمہ دار کا حق، دوسرے سرپرستی، معاملات کو دیکھنے وحل کرنے کا حق۔

اور حقِ حضانت کا تعلق نہ تو خرچ واخراجات سے ہے اور نہ سرپرستی ومعاملات کے حل کرنے۔ نکاح وغیرہ سے ہے، بلکہ اس کا تعلق بچہ کی جسمانی خدمت، نگہداشت و پرداخت سے ہے، یہ حق کم از کم سات سال تک عورتوں کا ہے، مسئلہ اہم اس وقت ہوتا ہے جبکہ زوجین میں علیحد گی ہو جائے یا ماں کا انتقال

ہوجائے مثلاً یہ حق ماں کا ہی ہے، ماں نہ ہو تو خالہ و نانی وغیرہ کا ہوتا ہے۔ بچہ ہو یا بچی سات سال کی عمر تک ماں، خالہ، نانی وغیرہ کے پاس رہیں گے، ان کی نگہداشت و پرداخت یہ عورتیں کریں گی، اس عرصے کا جو خرچ ہوگا وہ باپ یا جو ولی ہو وہ ہی ادا کرے گا، ضرورت ہوگی تو خدمت کرنے والی عورت کا خرچ بھی باپ و ولی برداشت کرے گا۔ سات سال کی عمر کے بعد کیا ہوگا، اس میں تفصیل واختلاف ہے۔

۳۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے یہ کتاب وسنت کی روشنی میں تمام کتبِ حدیث وکتبِ فقہ میں موجود ہے، آیات بھی ہیں اور روایات بھی پھر علماء امت، صحابہ وتابعین کی تصریحات بھی ہیں۔ اسلام کیا کہتا ہے اسی سے سمجھا جاسکتا ہے، کس کے نزدیک کتابوں میں کیا ہے؟ علماء امت نے کیا کہا ہے؟ اس کی کوئی اہمیت نہ ہو اور ہم نے کیا سمجھا یہی اہم ہو تو بات دوسری ہے!

۴۔ سوال ولایت کا کیا گیا ہے، جواب میں ڈاکٹر صاحب نے حضانت کی بات کہی ہے، اور نہ اس کی تفصیل کی ہے اور نہ ولایت کی کوئی تفصیل وتذکرہ ہے۔ اہل علم خود رجوع ومراجعت سے سمجھ سکتے ہیں۔

۵۔ مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی عقل کی اور اپنے فہم ومطالعہ کی بات اسلامیات و شرعیات کے بارے میں عموماً کرتے ہیں، قرآن سے جو وہ سمجھتے ہیں بس اس کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور اُس کو سمجھا کر مطمئن ہوجاتے ہیں یا مطمئن کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

آیات قرآنیہ سے متعلق ہی اور ان کی روشنی میں احادیث میں کیا ہے؟ یا استقلالاً احادیث میں کیا ہے؟ آثار صحابہ وتابعین میں کیا ہے؟ ائمہ اربعہ وغیرہ کی باتیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر نہیں، یا علم میں نہیں یا اہمیت نہیں واللہ اعلم اور یہ باتیں امت میں کس کے نظریات ومذہب کی ہیں؟ ڈاکٹر صاحب ہی وضاحت کرسکتے ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے ہی نہیں کہ علماء امت بشمول صحابہ وتابعین نے کیا کہا اور کیا سمجھا ہے؟ اس کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کی فکر ودعوت کا رخ کیا ہے؟ اور کیا ہوگا؟ اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مجموعۂ خطبات سے پانچویں چیز ''اسلام پر چالیس اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات'' ان سطور میں اسی آخری پانچویں سوالات و جوابات کے حصہ سے کچھ اہم قابل نظر و غور چیزیں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱۰) یا اخت ہارون کی غلط توجیہ

سوال ۳۹ر قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ مریم علیہا السلام ہارون علیہ السلام کی بہن تھیں، حضرت محمد اجنہوں نے قرآن تصنیف کیا (نعوذ باللہ) یہ بات نہیں جانتے تھے کہ ہارون علیہ السلام کی بہن مریم یسوع مسیح کی والدہ MARY سے مختلف عورت ہیں اور ان دونوں میں تقریباً ایک ہزار سال کا فاصلہ ہے؟

جواب: قرآن میں سورۂ مریم سورۂ نمبر ۱۹ر کی آیت نمبر ۲۷ر ۲۸ر میں کہا گیا ہے۔

ترجمہ: ''پھر وہ اسے اٹھا کر اپنی قوم کے پاس لائی، وہ بولے: اے مریم! تو لائی ہے غضب کی چیز، اے ہارون کی بہن! تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں ہی تھی بدکار۔''

عیسائی میشنری یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کو یسوع مسیح کی والدہ میری اور ہارون کی بہن مریم میں فرق کا پتہ نہیں تھا حالانکہ عربی میں بہن کے معنیٰ اولاد بھی ہیں اس لیے لوگوں نے مریم سے کہا کہ اے ہارون کی اولاد اور اصل میں اس سے مراد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد ہی ہے۔

بائبل میں بیٹا بھی اولاد کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، مثلاً انجیل کے باب ایک کے پہلے جملے میں ہے: ''یسوع مسیح داؤد کا بیٹا'' لوقا کی انجیل کے باب تین کے ۲۳ ویں جملے میں ہے۔ ''جب یسوع خود تعلیم دینے لگا اس وقت وہ تیس برس کا تھا اور یوسف کا بیٹا تھا''۔ ایک شخص کے دو باپ نہیں ہو سکتے، اس لیے جب یہ کہا جائے کہ یسوع مسیح علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کا بیٹا تھا تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ مسیح داؤد علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، بیٹا سے مراد جانشین یا اولاد ہے۔

اس بنا پر قرآن کریم کی سورۂ مریم نمبر ۱۹ر کی آیت نمبر ۲۸ر پر اعتراض بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ اس میں بیان کیے گئے ''ہارون کی بہن'' سے مراد حضرت مریم مسیح علیہ السلام کی والدہ ہیں جو حضرت

ہارون علیہ السلام کی اولاد یا ان کی نسل سے تھیں۔

حدیث کی روشنی یا اخت ھارون کی تحقیق

سوال میں مذکور اعتراض کوئی نیا نہیں اتنا قدیم ہے کہ عہد نبوی میں بھی سامنے آچکا ہے اور زبان نبوی سے اس کا جواب بھی دیا جاچکا ہے۔

تفسیر ابن کثیر (قاہرہ، مصر) ج:۵/ص:۲۲۲/میں روایت آئی ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے نجران بھیجا تو وہاں کے (عیسائی) لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم لوگ قرآن میں یا اخت ھارون پڑھتے ہو اور موسیٰ علیہ السلام تو حضرت عیسی علیہ السلام سے اتنے اتنے پہلے تھے۔ مغیرہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ واپس آیا تو رسول اللہ ﷺ سے یہ بات عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ان سے کیوں نے کہہ دیا کہ وہ لوگ سابقہ انبیاء وصلحاء کا نام رکھا کرتے تھے۔

یہ جواب نبی اکرم ﷺ سے محفوظ ومنقول ہے اور معروف ہے کیونکہ روایت ابن کثیر وطبری کے علاوہ صحاح ستہ میں صحیح مسلم (ج:۱۴/ص:۱۱۶/طبع دار الفکر، کتاب الآداب، باب النھی عن التکنی بأبی القاسم و بیان ما یستحب من الاسماء) ترمذی مع تحفہ، طبع دار الفکر بیروت (ج:۸/ص:۵۰۹ حدیث ۳۱۵۵/تفسیر سورۂ مریم) میں آئی ہے نیز نسائی، سنن صغریٰ اور مسند احمد وغیرہ میں بھی ہے جیسا کہ ابن کثیر وغیرہ میں مذکور ہے اور حدیث صحیح ہے کہ مسلم میں بھی ہے اور امام ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

جواب نبوی کا حاصل یہ ہے کہ مریم، والدہ عیسیٰ کے بھائی ہارون حضرت موسیٰ کے بھائی نہیں تھے مریم کے ہی بھائی تھے، ناموں کا اشتراک ہے کہ بنی اسرائیل کا معمول اپنے بڑوں اور بزرگوں کے نام رکھنے کا تھا جیسا کہ دنیا میں عموماً رہا اور آج بھی ہے۔

تفسیر ابن کثیر وغیرہ نے کچھ اور باتیں بھی کہی ولکھی اور نقل کی ہیں لیکن مقدم ومعتمد وہ جواب

ہے جو مرفوعاً نبی اکرم ﷺ سے بسندِ صحیح ثابت ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کا قرآن وحدیث کے انحراف نیز بائبل سے استدلال میں غلطی

ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب اسی ذوق کے حامل وداعی ہیں پھر بھی اس جواب کے بجائے اپنی طرف سے جواب دیا۔ یہ روایات سے صرفِ نظر ہے یا لاعلمی؟ جبکہ یہ انتہائی معروف چیز ہے جیسا کہ حوالوں سے واضح ہے۔

پھر اپنے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے سارا زور اس پر لگایا ہے کہ لفظ ''اخت'' اولاد کے معنیٰ میں ہے اور یہ ایک استعمال ہے اور استدلال میں بائبل وانجیل کا حوالہ تو دیا ہے مگر نہ دوسری کسی آیت کا، نہ کسی روایت کا اور نہ ہی لغتِ عرب اور اس کی کسی کتاب کا، ایک داعیٔ اسلام اور مسلم اسکالر کے استدلال کا یہ رخ کیسا؟

میں نے لغتِ عرب کی بڑی اساسی اور اہم ومعتمد کتاب ''لسان العرب'' سے بھی مراجعت، کی دیگر بعض کتب بھی دیکھیں، مگر لفظ ''اخ و اخت'' کا استعمال اولاد کے معنیٰ میں نہیں ملا۔ سفرِ معراج میں آسمانوں کی سیر وسفر کے بیان میں انبیاء سے ملاقات کا تذکرہ آیا ہے، اس میں کہیں لفظ ''اخ'' اور کہیں ''اب'' آیا ہے، جو انبیاء علیہم السلام آپ ﷺ کے سلسلہ نسب میں ہیں ان کے لیے لفظ ''اب'' اور جو اس طبقے کے نہیں ہیں ان کے لیے لفظِ ''اخ'' کا استعمال ہوا ہے، اگر ڈاکٹر صاحب کے ذکر کردہ معنیٰ میں استعمال عربیت کا ہوتا تو اس فرق کی ضرورت نہ تھی روایات معراج کے بیان میں کہیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح راغب اصفہانی کی کتاب ''المفردات فی غرائب القرآن'' دیکھی جو الفاظ قرآنیہ کے خود قرآن کے اندر مختلف معانی ومفاہیم میں استعمال کے بیان میں معروف ومقبول عام کتاب ہے اس میں لفظ ''اخ'' یا لفظِ ''اُخت'' کا ''اولاد'' کے معنیٰ میں استعمال کا کوئی تذکرہ نہیں

ہے، ہاں دوسری مناسبتوں کا تذکرہ ہے۔ مثلاً اخت ہارون سے متعلق ہی آیا ہے کہ صفات وکمالات میں اشتراک کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی ہوا ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر (ج :۵ص: ۲۲۱/طبع مذکور) میں بھی پہلے نمبر پر اسی مفہوم کو بعض حضرات سے نقل کیا گیا ہے۔ بہر حال کتب تفسیر اور کتب لغات میں یہ استعمال معروف کیا مذکور بھی نہیں ہے۔

۳) ڈاکٹر صاحب کے جواب میں لوقا کی انجیل کے حوالے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت یہ جملہ بھی آیا ہے ''یوسف کا بیٹا'' اہل علم اس سے ناواقف نہیں ہیں کہ کچھ لوگ حضرت عیسیٰ کی نسبت ''یوسف'' کی طرف کر کے کتاب وسنت کے خلاف ایک دعویٰ کرتے چلے آرہے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے اس حوالے میں کچھ اس قسم کی بات تو نہیں ہے؟

ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں انبیاء کے ناموں کے ساتھ ''علیہ السلام'' آیا ہے اور آنا چاہیے مگر حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ ''علیہ السلام'' آیا ہے اگر یہ عبارت وکتابت کی خامی نہیں تو مبلغِ علم سمجھا جاسکتا ہے کہ مؤنث کے لیے مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے۔

(۱۱) جنین کی وضاحت میں سائنس پر اعتماد اور مفسرین عظام پر تنقید

(۲) ص: ۴۹۲/س: ۱۵/تا ص: ۴۹۴/س ۹/

سوال ۲۸/ : قرآن میں ہے کہ کسی ماں کے رحم میں موجود بچے کی جنس صرف اللہ کو معلوم ہوتی ہے مگر اب سائنس کافی ترقی کر چکی ہے اور ہم آسانی سے الٹرا سونو گرافی کے ذریعے جنین کی تعیین کر سکتے ہیں کیا یہ قرآنی آیت میڈیکل سائنس کے خلاف نہیں ہے؟

جواب! : اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ قادر مطلق اور علیم وخبیر ہے، اس نے کچھ چیزوں کا علم انسانوں کو بھی دیا ہے مگر یہ ہر موجود اور غائب چیز کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی ماں کے رحم میں جنین کی جنس کو جانتا ہے، قرآن کہتا ہے سورۂ لقمان سورہ نمبر ۳۱/ آیت نمبر ۳۴/۔

ترجمہ: ''بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم وہی بارش نازل کرتا ہے، اور وہ ہی جانتا ہے جو ماں کے رحم میں ہے''

ایسے ہی ایک پیغام سورۂ رعد سورہ نمبر ۱۳/آیت نمبر ۸/ میں ہے۔ ترجمہ: ''اللہ ہی جانتا ہے جو ہر مادہ پیٹ میں رکھتی ہے اور جو رحم میں سکڑتا ہے اور بڑھتا ہے، اس کے نزدیک ہر چیز ایک اندازہ سے ہے'' آج کی سائنس ترقی کر چکی ہے اور الٹرا سونو گرافی کے ذریعہ حاملہ عورت کے رحم میں بچے کی جنس کا تعین آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن کی اس آیت کے مختلف ترجمے اور تشریحات میں یہ کہا گیا ہے کہ صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی جنس کیا ہے مگر اب اس آیت کا عربی متن ملاحظہ کریں تو دیکھیں گے کہ انگلش کا لفظ جنس (SEX) کا کوئی متبادل عربی لفظ استعمال نہیں ہوا۔ اصل میں قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ رحموں میں کیا ہے اس کا علم صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ہے۔ کافی مفسرین کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اس سے یہ معنیٰ مراد لیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی ماں کے رحم میں بچے کی جنس کو جانتا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ یہ آیت جنین کی جنس کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ماں کے رحم میں موجود بچے کی فطرت کیسی ہوگی اور کیا وہ اپنے ماں باپ کے لیے باعث برکت اور سعادت ہوگا یا باعث زحمت؟ کیا وہ معاشرے کے لیے باعثِ رحمت ہوگا یا عذاب کا باعث بنے گا؟ آیا وہ نیک ہوگا یا بد؟ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں، ان سب باتوں کا مکمل علم صرف اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کو ہے۔

دنیا کا کوئی سائنس داں چاہے اس کے پاس کتنے ہی ترقی یافتہ قسم کے آلات کیوں نہ ہوں ماں کے رحم میں موجود بچے کے بارے میں ان باتوں کا درست جواب نہیں دے سکے گا۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں جنین کی تحقیق

۱) کسی صاحبِ کلام کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک معروف ومسلمہ اصول ہے کے کلام کا

سیاق وسباق دیکھو، جیسا کہ بسا اوقات دوسرے امور کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔علماء امت نے قرآن فہمی کے لیے بھی اس اصول کا تذکرہ کیا ہے اور اس کو پہلے نمبر پر رکھا ہے۔ مشہور ہے ''القرآن یفسر بعضہ بعضاً''

رحم مادر میں جنین کی جنس کے علم کی تخصیص ان دونوں آیات کے تحت مراد ہے یا نہیں اس کے لیے دونوں آیات کو مکمل طور پر دیکھ لینا اور سامنے رکھنا کافی ہے۔

سورۂ لقمان کی مذکورہ آیت۔ نمبر ۳۴ رجو سورت کی آخری آیت ہے، اس میں پانچ چیزوں کا علم حق تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے، قیامت کا وقت، بارش کا وقت ومقدار، رحم مادر میں بچہ کی نوعیت، اور آدمی کا عمل وانجام اور آدمی کی موت کی جگہ (وقت)۔

اِس آیت میں تو رحم مادر کی چیز کے علم کا مجملاً تذکرہ ہے لیکن سورۂ رعد کی آیت نمبر ۸ ر جس کا تذکرہ ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا ہے اس میں مضمون والفاظ زیادہ ہیں اور مجموعی طور پر اس سے اس مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے جس کا ڈاکٹر صاحب نے انکار کیا ہے اس لیے کہ سورۂ رعد کی آیت میں ''اللہ یعلم ما تحمل انثی '' (اللہ ہی جانتا ہے کہ مادہ اپنے رحم میں کیا رکھے واٹھائے ہوئے ہے) کے بعد مزید آیا ہے۔ ''وما تغیض الأرحام وما تزداد '' ڈاکٹر صاحب نے اس سے کیا سمجھا اور کیا ترجمہ کیا۔ وہ جانیں۔ یہ ما تحمل کے ساتھ متصل اور مرتبط ہے اور ترجمہ ومفہوم یہ ہے کہ اللہ مادہ کے حمل کو جانتا ہے۔ اور رحموں میں جو کمی وبیشی ہوتی ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ اور کمی بیشی کس چیز کی۔ تو صحابہ سے زیادہ اس کو کون جان سکتا ہے کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی زبان سے قرآن بھی سنا اور اس کا مفہوم بھی سنا وسمجھا۔ تفسیر ابن کثیر (ج:۴/ص:۳۵۷) میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ کمی بیشی رحم کے بچے کے جسم کی اور مدتِ حمل کی مراد ہے۔

سورۂ لقمان کی آیت نیز سورۂ انعام کی آیت:۵۹ ر سے متعلق جو ایک معروف روایت ابن عمر کی ہے جو صحیح بخاری کی کتاب التفسیر کے اندر سورۂ انعام وسورۂ رعد دونوں کے تحت آئی ہے اور دوسری جگہوں میں بھی مذکور ہے۔ سورۂ رعد کی آیت مذکورہ کے تحت امام بخاری نے ابن عمر سے اس کو کسی قدر

تفصیل سے نقل کیا ہے اس میں ہے۔غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، کل کیا ہوگا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا'' **ولا یعلم ماتغیض الارحام الا الله** ''اور رحموں کی کمی بیشی کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اس روایت میں لفظ'' **لا یعلم مافی الارحام** ''سورہ لقمان کی آیت کا نہیں بلکہ سورۂ رعد کی آیت کا لفظ آیا ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں جگہ مفہوم وحاصل ایک ہے کہ ایک ہی راوی نقل کر رہا ہے۔

۲) تفسیر وقرآن فہمی کا دوسرا معروف ومسلم اصول ہے متعلقہ روایات کو دیکھنا، سورۂ رعد وسورۂ لقمان دونوں جگہوں میں معروف ومسلم کتب تفسیر جیسے ابن کثیر وغیرہ اور صحیح بخاری وغیرہ کی کتاب التفسیر میں روایات موجود ہیں۔

تفسیر ابن کثیر (ج:۶/ص:۳۵۶/طبع الشعب مصر) میں ابن ابی حاتم وابن جریر کے واسطے سے مجاہد (طبقۂ تابعین میں امام تفسیر) کی روایت نقل کی ہے کہ ایک بادیہ نشین نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ میری بیوی حاملہ ہے، بتایئے کہ وہ کیا جنے گی؟ (ظاہر ہے یہاں سوال لڑکے ولڑکی یعنی جنس کا ہی ہے) اور بارش نیز اپنی موت کے وقت کا بھی سوال کیا، اس پر سورۂ لقمان کی آیت نازل ہوئی۔

تفسیر ابن کثیر (ج:۶/ص:۳۵۶ و ۳۵۷) میں ہی ہے کہ طبقۂ تابعین کے ایک دوسرے معروف امامِ تفسیر قتادہ کا بیان ہے کہ کچھ چیزوں کا علم اللہ نے اپنے ساتھ مخصوص رکھا ہے اور ان سے کسی مقرب فرشتے یا نبی مرسل کو بھی واقف نہیں کرایا ہے، اس کے بعد سورۂ لقمان کی آیت کے پانچوں ٹکڑوں کو الگ الگ کر کے وضاحت سے ذکر کیا اور اسی میں فرمایا'' ویعلم ما فی الارحام'' کوئی نہیں جانتا کہ رحموں میں کیا ہے؟ لڑکا ہے یا لڑکی۔ سرخ یا کالا، یا کیا ہے؟

تفسیر درِ منثور، ج:۶/ص:۵۳۰/طبع دار الفکر۔ میں بواسطہ عکرمہ'' مجاہد'' کے مضمون والی روایت آئی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ لقمان آیت مذکورہ۔ اور ان روایات سے بھی واضح درمنثور (ج:۲/ص:۵۳۱/و۵۳۲/) میں مذکور حضرت ابوامامہ اور سلمہ ابن اکوع رضی اللہ عنہما کی روایات ہیں

،جن میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی اونٹنی کے حمل کے لیے اور دوسرے نے گھوڑی کے حمل کے لیے پوچھا کہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے آیت مذکورہ (سورۂ لقمان) کی تلاوت فرمائی۔

نقلی و عقلی غلطیاں

۳) ڈاکٹر صاحب نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اور معروف بات کو رد کرنے کے لیے کسی روایت کو دلیل نہیں بنایا ہے بلکہ سائنس کی ترقی اور اس بات کو کہ قرآنِ کریم نے کوئی ایسا لفظ ذکر نہیں کیا ہے جو جنس (SEX) کے مفہوم میں ہو، یہ صحیح ہے کہ جنس کا لفظ نہیں آیا ہے لیکن غور کا مقام ہے کہ جو لفظ آیا ہے کیا وہ اس کی تردید و نفی کرتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے، آیت کے الفاظ میں ''یَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامْ ''یعنی لفظ ''ما'' ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ذکر کردہ مفہوم کی تو گنجائش تو رکھتا ہے مگر جس مفہوم کی انہوں نے تردید کی ہے اس کی نفی کی گنجائش وصلاحیت بالکل نہیں رکھتا۔ آیت کا مفہوم ہے اللہ جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے اس کا اشارہ جتنا واضح جنس کی طرف ہے جیسا کہ صحابہ و تابعین سے مروی ہے صفت کی طرف نہیں ہے۔ جس میں انحصار کا دعویٰ کیا گیا ہے لفظ ''ما'' عربیت کی رو سے اسم موصول ہے اور مفہوم میں عموم رکھتا ہے جیسا کہ نحو و اصول فقہ وغیرہ کی کتب میں مذکور و معروف ہے۔

جہاں تک سائنس و آلات کی ترقی اور ان کے ذریعہ حصولِ علم کا معاملہ ہے تو تعجب کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب الٹراسونوگرافی سے حاصل ہونے والے نتائج کو قطعی مان رہے ہیں جبکہ مشاہدہ و تجربہ میں یہ بات بار بار آرہی ہے کہ اس قسم کے ٹسٹ وغیرہ کے نتائج غلط بھی سامنے آرہے ہیں، لوگ ان نتائج کی بنیاد پر اسقاط کرتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ضائع کیا جانے والا حمل بچہ تھا یا مٹھائی تقسیم ہو جاتی ہے اور ولادت بچی کی ہوتی ہے۔

یہ بھی سوچنے کی بات ہے ڈاکٹر صاحب کتاب وسنت کے ترجمان ہیں کیا کتاب وسنت کی رو سے یا اعضاء ظاہرہ (آنکھ کان وغیرہ) سے حاصل ہونے والے علم کے علاوہ بھی کوئی علم قطعیت رکھتا؟

ہے آسان جواب جو اسلامی ہے اور مسلم کامل کا جواب ہے وہ یہ ہے کہ آیت سائنس کے خلاف ہے ،حق تعالیٰ کا علم ایسے سارے امور میں قطعی اور بغیر کسی شک و وسائل کے بغیر ہے۔اور سائنس سے حاصل ہونے والا علم نہ قطعیت رکھتا ہے اور نہ کلیت اور نہ ہی بے اسباب ہے۔یہی جواب عصر حاضر کے ان حضرات علماء و مفسرین کا ہے جن کی کتاب وسنت پر صحیح نظر ہے اور عقیدہ بھی ہے۔

۴) اس موقع سے یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو مفہوم ذکر کیا ہے اور جس کو متعین و صحیح بتایا ہے، آیت اس کی نفی نہیں کرتی ،قرآن کریم کا ایک ایک لفظ بلیغ و جامع ہوتا ہے۔ لفظ ''ما'' اس مفہوم کی بھی وسعت رکھتا ہے چنانچہ معتمد مفسرین نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، لیکن اس طور پر کہ ڈاکٹر صاحب کی طرح حصر نہیں کیا ہے بلکہ اولاً جنس کا اور پھر دوسری چیزوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً ابن کثیر نے سورہ لقمان کی آیت کے تحت (ج:۶ر ص:۳۵۵) میں اس کو ذکر کیا ہے اور ج:۶ر ص:۳۵۸ر پر مشہور تابعی قتادہ سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

۵) ڈاکٹر صاحب کی عبارت میں جو بے ربطی وغیرہ ہے اس کے ساتھ ان کے درج ذیل الفاظ محلِ غور ہیں۔

''کافی مفسرین کو غلط فہمی ہوئی اور انہوں نے اس سے یہ معنیٰ مراد لیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی ماں کے رحم میں بچہ کی جنس کو جانتا ہے یہ درست نہیں ہے'' ۔مفسرین نے جو بات درایت (عربیت) اور روایت کی بنیاد پر کہی ہے وہ غلط فہمی اور نادرست ہے جبکہ ڈاکٹر صاحب کی بات۔ جو کہ نہ درایت سے مؤید ہے اور نہ روایت سے، جس انداز میں اُنہوں نے اپنی بات پیش کی ہے۔درست ہے یہ بو العجبی نہیں ہے تو کیا ہے!۔

(۱۲) جنت میں مرد حور، ص:۵۱۵ر میں س ۱۳، ص:۵۱۸ر میں س:۵۔

سوال ۳۷ر : قرآن کہتا ہے کہ جب کوئی شخص جنت میں داخل ہوگا تو اسے حوریں یعنی خوبصورت دوشیزائیں ملیں گی، جب کوئی عورت جنت میں جائے گی تو اسے کیا ملے گا؟

جواب : حور کا لفظ قرآن میں کم از کم چار جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) سورۂ دخان ۔ سورہ نمبر ۴۴/ آیت نمبر ۵۴/

ترجمہ: ''اوراسی طرح ہم خوبرو بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے ان کے جوڑے بنائیں گے''

(۲) سورۂ طور، سورہ نمبر ۵۲/ آیت نمبر ۲۰/

ترجمہ: ''اور ہم نے ان کی زوجیت میں دیا بڑی آنکھوں والی حوروں کو''۔

(۳) سورۂ رحمٰن: سورہ نمبر ۵۵/ آیت نمبر ۷۲/

ترجمہ: ''خیموں میں پردہ نشیں عورتیں (حوریں) ٹھہرائی گئیں''۔

(۴) سورۂ واقعہ: سورہ نمبر ۵۶/ آیت نمبر ۲۲، ۲۳/

ترجمہ: ''اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جیسے (موتی کے دانے) سیپی میں چھپے ہوئے''

قرآن کا ترجمہ کرنے والوں نے لفظ ''حور'' کا ترجمہ خاص طور پر اردو ترجمہ کرنے والوں نے خوبصورت دوشیزائیں یا لڑکیاں کیا ہے، ایسی صورت میں وہ صرف مردوں کے لیے ہوں گی پھر عورتوں کا کیا ہوگا؟

لفظِ ''حور'' اصل میں اَحْوَر اور حَوراء دونوں کا صیغہ جمع ہے اور یہ ایسے آدمی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی آنکھیں حور جیسی ہوں جو جنت میں جانے والے مردوں اور عورتوں کی نیک ارواح کو دی جانے والی خاص صفت ہے اور یہ روحانی آنکھ کے سفید حصے کی انتہائی اجلی رنگت کو ظاہر کرتی ہے۔ بہت سی دیگر آیات میں یہی کہا گیا ہے کہ جنت میں ازواج یعنی جوڑے ہوں گے اور تمہارا جوڑا پاک ساتھی ملے گا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سورۂ بقرہ سورہ نمبر ۲/ آیت نمبر ۲۵/ میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اوران لوگوں کو خوشخبری دو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب بھی انہیں اس سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا اور ان کے لیے اس میں بیویاں ہیں پاکیزہ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''

اور سورۂ نساء سورہ نمبر: ۴/ آیت نمبر: ۵۷/

ترجمہ: ''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ہم عنقریب انہیں باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ ان کے لیے پاک ستھری بیویاں ہیں اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے''

اس لیے حور کا لفظ کسی خاص جنس یا صفت کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ علامہ محمد اسد نے لفظ ''حور'' کا ترجمہ (Spouse) خاوند یا بیوی کیا ہے جبکہ عبد اللہ یوسف علی نے اسکا ترجمہ (Companion) ساتھی کیا ہے۔ اس لیے بعض علماء کے خیال میں جنت میں کسی مرد کو جو حور ملے گی وہ بڑی بڑی چمکتی انکھوں والی دوشیزہ ہوگی جبکہ جنتی عورت کو جو ساتھی ملے گا وہ بڑی بڑی روشن آنکھوں والا ہوگا۔

بہت سے علماء یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں جو لفظ ''حور'' استعمال کیا گیا ہے اس کا مطلب صرف عورتیں ہیں کیونکہ ان کا تذکرہ مردوں سے کیا گیا ہے۔

اس کا جواب جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو حدیث میں دیا گیا ہے، حضرت محمد ﷺ سے یہی پوچھا گیا کہ اگر مرد کو جنت میں خوبصورت دوشیزہ یعنی ''حور'' دی جائے گی تو عورتوں کو کیا ملے گا؟ انھوں نے فرمایا: ''عورتوں کو وہ ملے گا جس کی ان کے دل میں خواہش پیدا ہوگی نہ تو ان کے کانوں نے کبھی ان کا ذکر سنا ہوگا اور نہ ہی ان کی آنکھوں نے کبھی اسے دیکھا ہوگا'' دوسرے لفظوں میں عورتوں کو جنت میں کوئی خاص چیز دی جائے گی۔

تحقیق وتبصرہ

جواب کو پڑھیے اور لطف لیجیے، ڈاکٹر صاحب نے عجیب وغریب اور بالکل انوکھی بات ذکر کی ہے، میرا خیال ہے کہ خواص اہل علم کے کان ونظر بھی اس جواب وتفصیل سے ناآشنا ہی ہوں گے اور صورت یہ ہے کہ جواب سارا کا سارا ڈاکٹر صاحب کی منطق وعقل پر مبنی ہے، کچھ لغوی معنیٰ کا سہارا

لیا گیا ہے، اور حوالہ اگر ہے تو انھیں جیسے علم و تعلیم والے انگریزی مترجمینِ قرآن کا اور جواب کی وقعت بڑھانے کو محمد اسد صاحب کے ساتھ ''علامہ'' لگا دیا گیا ہے اور اس بات کو بعض علماء کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے غنیمت ہے کہ دوسری رائے زیادہ تر کی بتائی گئی ہے۔ اور نہ کسی آیت کا تذکرہ ہے خواہ اشارہ پر ہی مشتمل ہوتی۔ اور جن دو آیات کا تذکرہ اس عموم کے لیے کیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کا مدعا ہے تو ان دونوں آیات میں لفظ ''ازواج'' کا ترجمہ خود بیبیوں سے کیا ہے جو ظاہر ہے کہ مردوں کے لیے ہی ہوں گی۔

اور نہ کسی روایت کا تذکرہ، خواہ کسی صحابی یا تابعی کا ہی قول ہوتا۔ اخیر میں جس روایت کو ذکر کیا ہے اس کا حوالہ بھی ذکر نہیں کیا اور ابن کثیر، طبری، درمنثور وغیرہ میں اس روایت کے موقع و محل میں تلاش و نظر پر یہ روایت مجھ کو نہیں مل سکی، اور اس کے ذکر سے اور اس لفظ سے کہ عورتوں کو کچھ خاص چیز ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب کا مقصد اپنے مدعا پر استدلال ہے یا کچھ اور؟ واضح نہ ہو سکا۔

نہ ممتاز مفسرین و علماء محققین میں کسی کا نام و تذکرہ۔ بجز بعض علماء یا دو انگریزی مترجمین کے۔ ڈاکٹر صاحب یوں بھی علماءِ امت کا نام نہیں لیتے اور نہ ان کا حوالہ دیتے ہیں، علماء امت کیا اپنی تحقیقات میں صحابہ و تابعین کا بھی نام نہیں لیتے!

بہر حال لفظ ''حور'' لغۃً کیا ہے اور اس کے اصل لغوی معنیٰ کیا ہیں؟ اس سے قطعِ نظر کتاب و سنت میں کہیں کسی نسبت و عنوان سے اس مضمون کا تذکرہ نہیں ہے جس کو ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے بلکہ جنت کی مخصوص عورتوں کے تذکرہ کے ساتھ جنت کے مخصوص مردوں کا اگر تذکرہ ہے دنیا کے مردوں کے علاوہ تو بطورِ خادم کے نہ کہ کسی اور حیثیت سے۔

''حور'' کے ساتھ صفت کے طور پر ''مقصورات'' مؤنث کا لفظ لایا گیا ہے جیسے کہ سورۂ بقرہ و سورۂ نساء کی آیات میں ''ازواج'' کے ساتھ ''مطھرۃ'' کا لفظ بطور صفت کے لایا گیا ہے جو مؤنث ہے جبکہ لفظِ ''زوج و ازواج'' مطلق جوڑے کے معنیٰ میں ہے اور مرد و شوہر پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے

قرآن میں بھی ہوا ہے، مگر صفت کا صیغہ ایسے الفاظ کو مخصوص ومحدود کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ذکر کردہ ''حور'' والی چار آیات اور مذکورہ دو آیات کے علاوہ بعض آیات میں ''عین'' کا لفظ آیا ہے، لفظ ''عین'' کو عورتوں کے ساتھ خاص کر دیتی ہے (ملاحظہ ہو سورۂ صافات سورہ نمبر ۳۷/ ۴۸) جیسے کہ بعض آیات میں قاصرات الطرف کا لفظ حورعین کے بغیر آیا ہے (ملاحظہ ہوں سورۂ ص: سور نمبر ۳۸/ آیت نمبر ۵۲/ وسورۂ رحمٰن سورہ نمبر: آیت نمبر: ۵۶/)

ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ بالخصوص اردو ترجمہ کرنے والوں نے حور کو مخصوص کر دیا ہے لیکن بجز دو انگریزی مترجمین کے کسی عربی مفسر ومحقق سے دوسرا مفہوم نقل نہیں کیا۔ کیا چودہ سو سالہ عہد میں کسی صاحبِ نظر عالم ومفسر نے یہ بات ذکر کی ہے؟ اور اصل تو قرون اولیٰ کے حضرات ہیں ان میں سے کسی کے کلام میں کہیں کچھ ہے؟

(۳) اب ہم سے ایک روایت سنیے جو تفسیر ابن کثیر (طبع شعب) ج: ۸/ ص: نمبر ۱۰/ (تفسیر سورۂ واقعہ) میں طبرانی سے نقل کی گئی ہے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے روایت طبرانی کی معجم صغیر (۱/ ۱۱۰/ کما فی حاشیہ ابن کثیر) میں آئی ہے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ﷺ حق تعالیٰ کے ارشاد'' حور عین'' کی بابت مجھ کو بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حور گوری اور عین بڑی آنکھوں والی ان کے پپوٹے گدھ کے پروں کے درجے میں ہیں۔ میں نے عرض کیا: ارشاد باری ''کامثال اللؤلؤ المکنون'' کی بابت بتائیے، فرمایا: ان کی صفائی (چمک ودمک) اس موتی کی ہے جو سیپوں میں ہوتا ہے، جس کو کوئی ہاتھ نہ لگا ہو، میں نے عرض کیا کہ ارشاد باری تعالیٰ ''فیھن خیرات حسان'' کی بابت بتائیے، فرمایا: اخلاق کی اچھی اور چہرہ کی خوبصورت۔ میں نے عرض کیا کہ ارشاد باری ''کانھن بیض مکنون'' کی بابت بتائیے۔ فرمایا: ان کی نزاکت ایسی ہوگی جیسے انڈہ کے اندر کی وہ جھلی نازک ہوتی ہے جو چھلکے کے بعد اور اس سے متصل ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ارشاد باری ''عُرُبا اترابا'' کی

بابت بتائیے، فرمایا: یہ وہ عورتیں ہیں جن کی موت دنیا میں بڑھاپے میں آتی ہے کہ آنکھیں کمزور اور بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، حق تعالیٰ سبحانہٗ ان کو بڑھاپے کے بعد (دوبارہ) پیدا کریں گے تو ان کو باکرہ اور عُرُب یعنی محبّ ومحبوب بنادیں گے اور ایک عمر کا ہم سن ۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! بتائیے کہ دنیا کی عورتیں افضل ہیں یا حور عین؟ فرمایا: دنیا کی عورتیں حور عین سے افضل ہیں جیسے کہ کپڑے کے استر کے اوپر کا حصہ اچھا ہوتا ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں ہے (کہ دنیا کی عورتیں افضل ہیں)؟ فرمایا: اس وجہ سے کہ وہ نماز، روزہ اور اللہ عزوجل کی عبادت کرتی ہیں، اللہ ان کے چہروں کو نور کا لباس پہنائے گا اور ان کے جسموں کو ریشم سے آراستہ کرے گا ، گورا رنگ، ہرے کپڑے، زیورات زرد، ان کی دھونی کا ظرف موتی کا ہوگا، اور ان کی کنگھیاں سونے کی ہیں (آگے کچھ اشعار کا تذکرہ ہے جو وہ پڑھیں گی) میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ایک عورت دو، تین چار شوہروں سے (یکے بعد دیگرے) شادیاں کرتی ہے پھر اس کا انتقال ہوتا ہے اور وہ عورت اور اس کے سب شوہر سب جنت میں جائیں گے تو اس عورت کا شوہر (ان چند میں سے) کون ہوگا؟ فرمایا: اے ام سلمہ! اس کو اختیار دیا جائے گا تو ان میں جو سب سے اچھے اخلاق والا ہوگا اس کو وہ پسند کرلے گی اور کہے گی اے میرے پروردگار! اس کے اخلاق (ومعاملات) میرے ساتھ بہت اچھے رہے لہٰذا مجھ کو اس کی زوجیت میں دیدے اے ام سلمہ! حسن خلق دنیا وآخرت سب کی بھلائی کو سمیٹ لیتا ہے۔

ابن کثیر (ج:٦/ص:٣٦٩/سورۂ سجدہ) ودر منثور (ج:٦/٥٥٠/) میں سورۂ سجدہ سورہ نمبر ٣٢/ آیت نمبر ١٧/ کے تحت مخفی نعمتوں کے بیان و وضاحت میں بھی مزید در مزید حوروں کے ملنے وحاصل ہونے کا تذکرہ ہے۔

تکملہ: فی الوقت ان چیزوں پر اکتفا کی جاتی ہے، اتنا ہی اہل نظر واہل شعور کے لیے حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے انشاء اللہ ورنہ ایک ہی رسالہ میں بہت کچھ ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب تقریر سے تحریر میں بھی آرہے ہیں انگریزی اور اردو میں۔ اہل علم ونظر خود ان تحریرات کو حاصل کر کے مطالعہ کریں اور بصیرت حاصل کریں تو اچھا ہے۔

اچھی سے اچھی صلاحیت کا آدمی بھی کام اچھا اسی وقت کرتا ہے اور کر سکتا ہے جب وہ محدود رہے اور پابند رہے، ورنہ نام تو پیدا کر سکتا ہے کام نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ اس ذہانت کے حامل ہیں جو مناظرہ کا مزاج چاہتا ہے جس میں آدمی جواب دے کر پیچھا چھڑانے یا سامنے والے کرنے کی سعی کرتا ہے جواب حق ہے، موزوں ہے یہ ضروری نہیں ہوتا۔

ان کی چیزوں سے واضح ہے کہ دینِ حق کا ترجمان ہونے کی حیثیت سے کتاب وسنت سے جس درجہ کی واقفیت کی ضرورت ہے وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس نہیں ہے، مطالعہ بھی زیادہ تر انگریزی کا ہی ہے، عربی سے بھی مطلوبہ کام کے مناسب واقفیت نہیں ہے، جس کا جی چاہے ان کے خطبات "قرآن اور جدید سائنس" کا مطالعہ کر کے تصدیق کر لے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلائے اور صراطِ مستقیم وہی ہے جس پر اللہ کے وہ بندے چلے جن کا تذکرہ سورۂ فاتحہ میں ہے۔ لہٰذا جو بھی صراطِ مستقیم پر چلنے کا خواہشمند ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان حضرات کو ان کی زندگی کو ان کے معتقدات ونظریات کو اپنائے۔